قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ———

ٹیلیفون : ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مدیرِ مسئول : مرزا محمد خلیل

معاونین : ثریا عندلیب

محمد عمر دراز

ناشر : شیخ عبدالحمید

طابع : خالد منصور نسیم

مطبع : النور پرنٹرز و پبلشرز

۲/۷ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۲۷۵۸۲۶

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

۱۔ لمعات (۱) بہاولپور کا فضائی حادثہ ۲

(۲) ایران۔ عراق جنگ

۲۔ یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ! محترم بشیر احمد عابد۔ ریاض سعودی عرب ۶

۳۔ سردار عبدالقیوم کی بانیانِ پاکستان پر بےجا تنقید۔ محمد عمر دراز ۱۱

۴۔ اقامتِ صلوٰۃ ۔ محترمہ ثریا عندلیب ۲۵

۵۔ شریعت آرڈی ننس۔ محترم محمد اسلام کراچی ۳۳

۶۔ شخصیت پرستی کی لعنت ۔ خالد منصور نسیم ۴۴

۷۔ قرآنی تعلیمات سے متعلق استفسارات ۵۲

۸۔ حسن عباس رضوی مرحوم۔ محترم عبدالغفور محسن کوئٹہ ۵۴

۹۔ نقد و نظر (تحریکِ پاکستان نوائے وقت کے اداریوں کی روشنی میں)۔ محمد ارمغان ثاقب ۵۷

۱۰۔ حقائق و عبر ۶۰

۱۱۔ توبہ اور اصلاح کا انقلابی تصور (انگریزی)۔ محترم حبیب الرحمٰن خان

۱۲۔ سر سید احمد خان بحیثیت ایجوکیشنسٹ (انگریزی) محترمہ شمیم انور ۸۰

جلد ۴۱ [redacted] ۱۹۸۸ء شمارہ ۹

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۶۰ روپے

بیرونی ممالک ——— (بذریعہ سمندری ڈاک) ۱۲۵ روپے

فی پرچہ : -/۵ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۱۔ قومی اخبارات میں شائع شدہ خبروں کے مطابق، ۱۷؍اگست ۱۹۸۸ء کی سہ پہر، صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق، خیرپور میں فوجی مشقیں دیکھنے کے بعد اپنے خاص ہوائی جہاز (پاک فضائیہ کے "سی۔۱۳۰") میں سوار ہو کر بہاولپور کے ہوائی اڈے سے ۳ بجکر ۴۸ منٹ پر روانہ ہوئے۔ جہاز نے ابھی ۴ منٹ کی پرواز ہی طے کی تھی کہ ایک دھماکے کے ساتھ فضا میں پھٹ گیا اور جہاز کے تمام مسافرین، جن میں صدر مملکت کے ساتھ ۲۹ دوسرے افراد بھی شامل تھے، جاں بحق ہو گئے۔ اس حادثہ میں جاں بحق ہونے والے دوسرے افراد میں پاک بری فوج کے ایک جنرل (اختر عبد الرحمٰن) ایک لیفٹیننٹ جنرل (میاں محمد افضال) تین میجر جنرل (محمد شریف ناصر، عبد السمیع اور محمد حسین اعوان) پانچ بریگیڈیئر (نجیب احمد، معین الدین خواجہ، صدیق سالک، محمد لطیف اور عبد المجید)، ایک کرنل (صفدر محمود)، ایک کیپٹن (زاہد رانا) ایک نائب صوبیدار (محمد شفیق) پاک فضائیہ کے ایک ونگ کمانڈر (مشہود) دو سکواڈرن لیڈر (راحت مجید صدیقی اور ذوالفقار) دو فلائیٹ لیفٹیننٹ (ساجد اور عصمت)، ایک چیف وارنٹ آفیسر (دوریز　) ایک چیف ٹیکنیشن (رفیق) ۶ سینئر ٹیکنیشن (فردوس، حبیب، رشید، عزیز، منظر اور اظہر) اور ایک جونیئر ٹیکنیشن (شفقت)، شامل تھے۔ ان کے علاوہ امریکی سفیر مسٹر آرنلڈ رافیل اور امریکی سفارت خانے کے بریگیڈیئر جنرل واسم بھی اسی حادثہ کا شکار ہوئے۔

اس حادثۂ فاجعہ کی تحقیقات کا حکم دے دیا گیا ہے اور پاک فضائیہ کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق، تخریب کاری کے امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

اس المناک حادثہ　کے سلسلہ میں قوم جس بارے میں ہمہ تن سوال ہے وہ سربراہ مملکت کے لئے حفاظتی انتظامات کا مسئلہ ہے۔ اہم شخصیات جب ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے کوئی وسیلۂ سفر اختیار کرتی ہیں تو قانون کے مطابق اس ذریعۂ سفر (کار، ریل گاڑی، بحری جہاز یا ہوائی جہاز وغیرہ) سے متعلق انتہائی حفاظتی اقدامات عمل میں لائے جاتے ہیں اور ان شخصیات کے ان پر سوار ہونے سے پہلے اس امر کا یقین حاصل کیا جاتا ہے کہ یہ ہر قسم کی تخریب کاری سے محفوظ و مامون ہے یعنی SECURITY CLEARANCE

کے بغیر کوئی ذریعۂ سفر استعمال نہیں کیا جاتا۔ کیا بہاولپور کے ہوائی اڈے پر صدرِ مملکت اور ان کے ساتھیوں کے سوار ہونے سے پہلے اس جہاز سے متعلق یہ انتہائی حفاظتی اقدامات اختیار کرتے ہوئے اسے ہر طرح سے محفوظ و مصئون ہونے کا یقین حاصل کر لیا گیا تھا؟ اگر ان میں کہیں دانستہ یا نادانستہ غفلت ہوئی ہے تو تحقیقاتی کمیٹی کا یہ فرض ہے کہ وہ ان ذمہ دار افراد کو ڈھونڈ نکالے جن کی کوتاہی یا سازش کے نتیجہ میں اتنی جانیں ضائع ہوئیں اور حکومت کا فریضہ ہے کہ انہیں قوم کے سامنے پیش کرے اور انہیں قرار واقعی سزائیں دے۔

دوسرا اہم سوال جو سب کے ذہنوں میں اُٹھ رہا ہے یہ ہے کہ پاک فضائیہ کے ایک افسر کے اخباری بیان کے مطابق، پاک آرمی کے قوانین کی رُو سے کسی ایک جہاز (یا ذریعۂ سفر) میں ایک سے زیادہ جرنیل سفر نہیں کر سکتے۔ اگر یہ صحیح ہے تو قوم یہ جاننا چاہتی ہے کہ پاک فوج کے اتنے جرنیل اور دوسرے اعلیٰ افسروں کے لئے الگ الگ ذرائع سفر کیوں اختیار نہیں کئے گئے اور ہماری جانباز افواج کے تجربہ کار افسران کی اتنی کثیر تعداد میں ضیاع کا ذمہ دار کون ہے؟

یوں تو مرحوم صدرِ مملکت کے دورِ حکومت میں بھی پورا ملک تخریب کاروں کے لئے کھیل کا میدان بنا رہا ہے اور ہماری امن و امان نافذ کرنے والی ایجنسیاں اور تخریب کاری کے سدِ باب کے خصوصی دستے اپنے دعوؤں کے مطابق سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ ملک سے تخریب کاری کا قلع قمع کیا جائے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس سرعت، تندہی اور صلاحیت و لیاقت سے انہیں اس قومی المیہ سے نپٹنا چاہیئے، وہ اس پر پورا نہیں اُتر سکے اور اگر یہ حادثہ بھی تخریب کاری کا ہی نتیجہ ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تخریب کاروں کے حوصلے اب اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ اپنے روزمرہ کے اہداف سے ہٹ کر سربراہِ مملکت تک کو اپنا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ ایک ایسی انتہائی تشویشناک اور سنگین ترین صورتِ حال ہے جو ہمارے قومی نظامِ تحفظ و امن کے لئے اولین چیلنج ہونا چاہیئے تاکہ قوم کا ہر فرد اپنے آپ کو محفوظ سمجھ سکے۔

۲۔ ایران عراق جنگ

ایران عراق جنگ، جو ان طاغوتی طاقتوں کی سازشوں سے شروع ہوئی جنہیں اسلامی ممالک کی ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی، مسلسل آٹھ سال تک، ان ہر دو اسلامی ممالک اور ان دونوں کے حلیف اسلامی ممالک کے بے بہا وسائل کو بے دریغ ضائع کراتی رہی، بالآخر بند ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کے دوران، گراں بہا مالی وسائل کے علاوہ، بیس لاکھ افراد متاثر ہوئے جن میں سے دس لاکھ ہلاک شدگان ہیں۔

اس جنگ کے دونوں فریق اللہ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی لائی ہوئی کتاب عظیم (القرآن الکریم) پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ (۱۹/۴۰) "بلاشبہ ہم ہی زمین کے وارث ہیں"۔ اور یہ دونوں ممالک، اس قطعۂ ارض یا علاقہ پر، جسے اللہ تعالیٰ اپنی وراثت اور ملکیت بتاتے ہیں (وَ لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳/۱۸۹)) اپنا حقِ ملکیت ثبت کرنے کے لئے آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ اس جنگ کے دوران اسلامی اُمّہ کمیٹی اور دیگر بین الاقوامی اداروں نے جنگ بندی کے لئے انتہائی کوششیں کیں مگر انہیں کسی صورت کامیابی نہ ہوئی۔ اسلامی دنیا کی کوششیں کیوں بارآور نہ ہوئیں۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یوں دیا ہے۔

وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝ (۴۹/۹)

اگر (کبھی سوءِ اتفاق سے ایسا ہو کہ) مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان میں صلح کرا دو۔ اگر اس کے بعد ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو تم اس زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف اُٹھ کھڑے ہو تاآنکہ وہ اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئے جو قانونِ خداوندی کی رُو سے کیا گیا تھا۔ اگر وہ اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئے تو ان میں عدل و انصاف کی رُو سے پھر صلح کرا دو۔ اور ہمیشہ انصاف کو ملحوظ رکھو۔ یہ چیز قانونِ خداوندی کی رُو سے بڑی مستحسن ہے۔"

یہ جو کہا گیا ہے کہ "تم ان میں صلح کرا دو" تو اس سے مُراد، اسلامی مملکت (اُمّت کی مرکزی اتھارٹی) ہے جو اس قدر صاحبِ قوت ہوتی ہے کہ اپنے فیصلوں کے خلاف سرکشی کرنے والوں کی سرکوبی کر سکتی ہے۔

یہ تھی اسلامی مملکت میں، متحارب گروہوں کی باہمی مناقشت کا مسئلہ حل کرنے کی صورت۔ جس دن اُمّت کی یہ مرکزی اتھارٹی ختم ہو گئی، اسلام عملاً باقی نہ رہا۔ پھر مسلمان ایک قوم رہ گئے اور دنیا کی دوسری قوموں کی طرح، مختلف ممالک (اور اقوام) میں بٹ گئے۔ یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم اپنے باہمی معاملات، یا دیگر مسلمانوں کے ممالک کے معاملات پر غور و فکر کرنے کے لئے اسلام کا نام خواہ مخواہ درمیان میں لے

آتے ہیں۔ جب اسلام اس شکل میں کہیں موجود ہی نہیں تو اسلام کا نام لینے سے کیا فائدہ؟ اسلام نام ہے ایک اُمّتِ واحدہ، اس کے ایک ضابطۂ قوانین (قرآن) اور ایک مرکزی اتھارٹی (اسلامی مملکت) کا۔ جب یہ نہیں تو اسلام بھی نہیں۔ اب مسلمان نام رکھانے والی قوم کے مختلف ممالک ہیں اور بس۔

بہرحال، تمام ممکنہ کوششوں سے، جنگ بندی کی مساعی کے علی الرغم یہ جنگ جاری رہی تاآنکہ ایران نے بھی اس بے مقصد جنگ کے خاتمے کے لئے ضرورت محسوس کرتے ہوئے، یکایک سلامتی کونسل کے ریزولیوشن (۵۹۸ء) کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ (عراق اس ریزولیوشن کو بہت پہلے تسلیم کر چکا تھا) جس کے بعد جنگ بندی کی کوششوں میں کامیابی کے امکانات پیدا ہو گئے اور بالآخر، ۲۰ اگست ۱۹۸۸ء کو اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں جنگ بندی عمل میں آگئی۔ ہم بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ:-

ہر چہ کند دانا، کند ناداں لیکن بعد از خرابیٔ بسیار!

بقیہ یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ از صفحہ ۱۰

سنگ باری کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مفاد پرستانہ گروہوں کی سازشیں اور مکر السیئات بھی کچھ کم نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نظام کے قائم کرنے والوں کو ہر دور اور ہر مقام پر سخت مصائب کا سامنا رہا۔ خود حضور اکرمؐ کی حیاتِ مبارکہ اس پر عادل شاہد ہے۔ آپؐ نے بھی کچھ کم مصائب و مشکلات کا سامنا نہیں کیا۔ لیکن جیسا کہ اعلانِ حق ہے وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹) بالآخر، فرعون سرنگوں ہوا ہے اور ہر قمر شق ہوا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس امر کی شہادت ہے کہ آخر الامر، فتح و کامرانی کی خوش خبریاں ان کے لئے ہوں گی جو اس جدوجہد میں ثابت قدم رہیں گے۔ اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں ان کی نگاہیں اس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا مقصدِ زندگی، نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ مشکلیں آتی ہیں تو آئیں، ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا۔ وہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے۔ اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ یہی وہ انقلابی جماعت ہے، جو اپنے نشوونما دینے والے کے نزدیک مستحقِ ہزار تبریک و تہنیت ہے۔ انہیں اس کے قانون کی تائید حاصل ہے۔ انہی کے لئے سامانِ نشوونما کی فراوانی اور الطاف و اکرام کی بارشیں ہیں۔ اور ان کا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ (۲/۱۵۷-۱۵۵)

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۴/۱۷۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بشیر احمد عابد
ریاض، سعودی عرب

یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ - قُمْ فَاَنْذِرْ

"اے وہ کہ جس کے ذمے، عالمِ انسانیت کو سنوار کر ایک جہانِ نو کو وجود میں لانے اور اسطرح حق کے نظام کو ہر باطل نظام پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے، اُٹھ! اور خود فراموش انسانوں کو ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر" (۷۴/۱-۲)

قرآن کریم کے ان ارشادات کی اولین مخاطب تو حضور اکرمؐ کی ذاتِ اقدس تھی لیکن فی الحقیقت یہ ذمہ داری ہر اس فرد پر عاید ہوتی ہے جو قوانینِ خداوندی کی صداقت اور نتیجہ خیزی پر ایمان رکھتا ہو اور اچھی طرح سمجھتا ہو کہ نوعِ انسان اس وقت جس تشتّت و افتراق، معاشی بدحالی، اور اخلاقی فرسودگی سے دوچار ہے اس کا حل فقط یہی ہے کہ معاشرے میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کے قوانین کو حاصل ہو۔ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (۲۹/۴۵)

تحریکِ طلوعِ اسلام کا قافلہ ایک مدت سے اس عظیم ذمہ داری کو اٹھائے، شاداں و فرحاں، منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھائے چلے جا رہا ہے۔ اس کارواں کے سالارِ اوّل علامہ غلام احمد پرویزؒ نے اپنی زندگی کا ایک کثیر حصہ فکرِ قرآنی کو اُجاگر کرنے میں گذارا اور اپنے پیچھے معارفِ قرآنی کے سلسلے میں تصانیف و تالیفات کا ایک ایسا انمول خزانہ چھوڑا جس کی قدر و قیمت کا تعین تب ہوگا جب انشاء اللہ یہ فکر اپنے محسوس پیکروں میں ڈھلے گی۔ اس مردِ قلندر نے قرآنِ حکیم کے حقائق کو جو صدیوں سے روایات کی دلدل میں دھنسے تھے ایک ایک کر کے نکالا اور انہیں ایسے منفرد انداز میں پیش کیا کہ جس سے ان کی معانی و مطالب کی وسعتیں حدود ناآشنا ہو جاتی ہیں۔ یہ تسلسل اور ربط ایسا دلکش و دلنشین کہ جی بار بار پڑھنے کو چاہے۔ اثر انگیزی ایسی جو وسیع النظری اور کشادِ قلبی کا موجب بنے۔ روح کو تڑپا دے اور بقول علامہ اقبالؒ دل پکار اٹھے ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — این کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شُد، جہاں دیگر شود

محترم پرویزؒ صاحب کی پیش کردہ بصیرتِ قرآنی سے ایک دنیا بدل جاتی ہے۔ مجھے اس فکر سے وابستہ ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ لیکن لگتا ہے کہ یہ فکر میری ہستی کا تقاضا تھی۔ اس سے پہلے کی زندگی روایتی اندازِ فکر کی زندگی تھی۔ وہ فکر کہ جو اس قول کے مصداق (بغل میں چھری منہ میں رام رام) دائمی منافقت

پر مبنی تھی۔ نہ قول و فعل میں مطابقت اور نہ ہی دل و دماغ میں ہم آہنگی۔ ایسا اتفاقاً ہی ہوتا تھا کہ دل کی بات کبھی زبان تک آجائے۔ ورنہ جھوٹ، مکر، فریب اس فکر کے بنیادی تقاضے تھے۔ زندگی ایک عجیب قسم کی منافقت اور گاذبیت سے دوچار تھی۔ لیکن اس کے باوجود اپنی مسلمانی پر ناز تھا۔ اور بنی اسرائیل کی طرح یہ خوش فہمی بھی کہ جنت کے صحیح حقدار ہم ہی ہیں۔ نہ خدا کا صحیح تصور، نہ رسولؐ کا اور نہ ہی کتاب کی صحیح تعلیم کا علم تھا۔ ہر بات ظن و قیاس پر مبنی تھی۔ حقیقت کی تلاش تو درکنار کبھی آمنا سامنا بھی ہو جاتا تو آنکھیں چرا لیتے۔ تقلید نے اپنی لگام اتنی مضبوطی سے چڑھائی ہوئی تھی کہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ سامنے نہ سہی کبھی ادھر اُدھر ہی گردن موڑ کر دیکھ لیتے۔ کیفیت یہ تھی کہ آنکھیں بند، کانوں میں ڈاٹ لگے اور دل پر تالے ڈالے مولوی صاحب کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ خطرہ تھا تو فقط اتنا کہ کہیں اس شاہراہِ اعظم کے پُل صراط سے گر نہ پڑیں۔ پرویزؒ صاحب کی فکر سے پالا پڑا تو پہلے پہل یہی کیفیت تھی۔ اسے معرکۂ حق و باطل قرار دے کر مسلسل آٹھ سال تک یہ جنگ لڑتا رہا لیکن جو قرآنِ کریم کا ارشاد ہے

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ، حق کی تعمیری قوتیں، باطل کی تخریبی قوتوں پر برابر ضرب کاری لگاتی رہتی ہیں، اور اس طرح فَيَدْمَغُهُ ان کا سر کچل کر رکھ دیتی ہیں اور فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ باطل شکست کھا کر بھاگ اٹھتا ہے (۲۱/۱۸)، اسی طرح ہمارے باطل کی ہوا بھی اُکھڑ گئی، آنکھوں کے اندھیرے چھٹ گئے، کانوں کے ڈاٹ نکل پڑے اور دل کے تالے ٹوٹ گئے۔ محترم پرویزؒ صاحب نے ہمیں ایک نئی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ ظن و قیاس سے مبرا، ایمان و ایقان کی حقیقی دنیا، نہایت بلند مقاصد والی واضح نصب العین کے ساتھ زندگی کی اعلیٰ اقدار لئے ایسی دنیا کہ جس میں جو زندگی بھی جنم لیگی اور پروان چڑھے گی۔ ہمیشہ مسرتوں اور خوشحالیوں کے جھولے گی اور شرفِ انسانیت کی رفعتوں سے ہمکنار رہو گی۔

انسانی زندگی جو فطرت کی اعلیٰ ترین تخلیق ہے، اس کی نقاشی بڑے بڑے مفکروں اور فلاسفروں نے کی ہے۔ لیکن اس کے جو خط و خال پرویزؒ صاحب کی بصیرتِ فرقانی نے کھینچے ہیں ان پر جوں جوں نگاہِ بصیرت غور کرتی ہے تو طبیعت مچل اُٹھتی ہے کہ کب فطرت کی یہ حسین دلوی اپنے محسوس پیکر میں جلوہ گر ہو گی کہ جسے دیکھ کر ہر انسان بلا ساختہ پکار اٹھے گا واہ اِبنانے والے تو نے کیا حسین شے تخلیق کی ہے۔ واقعی حمد و ستائش کی سزاوار صرف تیری ذاتِ کبریا ہے۔ آج یہی زندگی انسانوں کے خود ساختہ آئین و شرائع کی زنجیروں میں جکڑی ایک بے بس قیدی کی طرح مستبد حکمرانوں کے جور و ستم کا شکار ہے، ترستی نگاہوں اور دبی آہوں سے ہر آنے والے مفکر، عالم اور مصلح کو دیکھ رہی ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کون ہے جو اس کے بوجھوں کو دور کر دے اور اس کی زنجیروں کو کاٹ پھینکے۔ اس طرح کہ جیسے

آج سے چودہ سو سال قبل عرب کے بے آب و گیاہ ریگزاروں میں محمد الرسول اللہ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ نے کیا تھا۔

برادرانِ عزیز۔ یہ فریضہ آج ہم سب نے سرانجام دینا ہے۔ یہ ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے، کیونکہ زندگی کے ان خطوط کا علم صرف ہمیں ہے۔ اگر ہم نے اس ذمہ داری کو محسوس نہ کیا اور اس سے غفلت کے مرتکب ہوئے تو یاد رکھیئے ہم دوہرے عذاب کے مستحق قرار پائیں گے۔ وہ اس طرح کہ ایک تو ہمیں مرض کا علم ہے اور دوسرا ہم نسخہ بھی جانتے ہیں۔ ایک مریض جسے اپنے نسخے کا صحیح علم نہ ہو وہ کچھ نہ کچھ استعمال کرتا رہتا ہے، جس سے اسے خواہ عارضی ہی سہی، سکون ملتا رہتا ہے۔ ہم تو اس سکون سے بھی گئے۔ میزانِ خداوندی میں ہم جس طرف سے بھی حسنات ڈالیں گے، ہماری اس کوتاہی کے مقابلے میں وہ کم ہی رہیں گی۔ جب تک یہ پیغام اپنی عملی شکل اختیار نہیں کرتا ہمیں نہ دن دیکھنا ہے اور نہ رات، ہمہ وقت اس فکر میں منہمک رہنا چاہیئے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ جنہیں اس عظیم ذمہ داری کا ایک بار احساس ہو جاتا ہے۔ تو ان کی جدوجہد اور سعیٔ عمل کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ انکے پہلو بستر سے ناآشنا ہو جاتے ہیں، اور وہ معاشرے میں خوشگوار نتائج پیدا کرنے کی توقع اور اسے تباہ کن خطرات سے محفوظ رکھنے کے احساس سے ہر مقام پر قانونِ خداوندی کو پکارتے ہیں یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا تاکہ ان کا کوئی قدم غلط سمت کی طرف نہ اٹھ جائے اور اس مقصد کے لئے وہ ہر اس شے کو جو ہم نے انہیں دے رکھی ہے۔ ضرورتمندوں کی پرورش کے لئے کھلا رکھتے ہیں وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (۳۲/۱۶) یوں نظامِ خداوندی عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

میں گذشتہ دنوں پاکستان گیا تھا۔ اس فکر سے وابستگی کے بعد احباب سے میرا یہ پہلا رابطہ تھا۔ جس کسی سے بھی ملا اس کے دل میں یہی تڑپ اور یہی اُمنگ پائی۔ اس تحریک کو تیز سے تیز تر کرنے کے لئے ہر کسی کے دل میں جذبات مچل رہے ہیں۔ لیکن واضح پروگرام اکثر کے سامنے نہیں۔ درس ہوتا ہے وہ بھی ہفتے میں ایک بار۔ کچھ احباب طلوعِ اسلام بھی باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے تو وہ اس قدر مہنگی ہیں کہ عام آدمی خرید ہی نہیں سکتا۔ احبابِ نظم و نسق سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فنڈز کی کمی کی شکایت کی۔ وہ اچھی طرح آگاہ ہیں کہ اس فکر کو پھیلانے کے لئے کیا کیا ذرائع اختیار کیئے جا سکتے ہیں لیکن بقول ان کے اس کے لئے فنڈ چاہئیں۔ اور جہاں فنڈز کا معاملہ ہوتا ہے تو اس ضمن میں ہر کوئی محتاط رہتا ہے۔ مولویوں کے ہاں تو یہ معمولی بات ہے۔ ذرا سا چیخے چلائے، تقریر جھاڑی اور ایک آدھ نعت پڑھ کر چندہ اکٹھا کر لیا۔ لیکن تحریکِ طلوعِ اسلام والے ایسا نہیں کر سکتے۔ انہوں نے بجا کہا کہ

اس فکر سے وابستہ احباب کو اپنی ذمہ داریاں خود محسوس کرنی چاہئیں۔ اس فکر سے وابستگان کا بنیادی خاصہ ہی قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ وہ اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا رکھتے ہیں (۲/۳)۔ لہٰذا ایسے میں کسی چندہ کے لئے اپیل کرنا اس فکر کی بنیادی تعلیمات سے متصادم ہوگا۔ البتہ یاددہانی کے طور پر صرف احساس دلایا جاسکتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ مشفق والدین اپنی صالح اولاد کو اس وقت جبکہ وہ سہل انگاری کی بنا پر غفلت کا شکار ہو جائیں۔ یاد دلایا کرتے ہیں کہ ان کے فرائض کیا ہیں یاد رکھیئے! اس فکر کی ترویج اور تشہیر کے لئے ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں یا کریں گے اس سے مقصود نہ تو کسی فرد کی ذات کو اُجاگر کرنا ہے اور نہ ہی کسی ادارے کے مخصوص مقاصد کی تکمیل۔ اس کا واحد مقصد نظامِ خداوندی کا قیام و استحکام ہے۔ اسی میں ہم سب کی فلاح ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ خدا کے نزدیک جہنم کی زندگی سے حفاظت اور جنت کی زندگی کے لئے اہلیت کا پیمانہ انسانی ذات کی نشوونما ہے، ارشاد ہے۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا (ان کے رہنے کے لئے ایسے باغات ہوں گے جن کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی، اور ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى (۲۰/۷۶) یہ اس کا صلہ ہے جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی۔ اور یاد رہے کہ ذات کی نشوونما کے لئے قرآنِ کریم کا اصول ہے اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸) جس نے اپنا سب کچھ (ما۔ لہ) نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے دے دیا اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہو گئی۔ اس سب کچھ (ما۔ لہ) میں مال، محنت، وقت اور صلاحیت سبھی آجاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس کے پاس ان چاروں میں سے کچھ نہ کچھ زائد از ضرورت نہ ہو۔ اور ہر زائد از ضرورت مال نظامِ خداوندی کا ہے۔ کہا یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط اے رسولؐ یہ سوال کرتے ہیں کہ نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کیا کھلا رکھا جائے۔ قُلِ الْعَفْوَ ط (۲/۲۱۱) ان سے کہو کہ جو زائد از ضرورت ہو وہ سب کا سب نظامِ خداوندی کا حق ہے، پہلے اس کے قیام کے لئے اور بعد میں اس کے استحکام کے لئے۔ پرویز صاحب نے کہا ہے کہ قرآنی نظامِ معیشت کی بنیاد ہی انفاق پر ہے۔ دولت کو جمع کر کے، اسے صرف اپنی ذات کے لئے سمیٹ رکھنا بخل ہے، جو مومن کی ذہنیت کی ضد ہے۔ مومن بڑی محنت سے کماتا ہے اور اپنی ضروریات سے زائد جتنی دولت ہو اسے انسانیت کی بہبود کے لئے ہر وقت کھلا رکھتا ہے کہ قرآنی نظام کو جس وقت ضرورت پڑے اسے اس مقصد کے لئے لے لے۔ اور خدا کے نزدیک تو انفاق، ایمان کے ماپنے کا پیمانہ ہے (۳۴/۳۹) اس کا بدلہ اس طرح ملے گا جیسے خزاں کے بعد درختوں پر بہار آتی ہے (۳۴/۳۹) لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا اور مفاداتِ عاجلہ کے پیشِ نظر بخل کی راہ اختیار کی تو حکم خداوندی ہے کہ "بخل کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ یہ روش ان کے لئے خیر کا موجب ہوگی یہ ان کے

لئے تباہی کا موجب ہے۔ قرآنی انقلاب کے وقت یہ مال و دولت ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ اس تاکید سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ لوگوں کے مال کا محتاج ہے۔ یہ احکام تمہارے ہی حق میں بہتری کا موجب ہیں۔" (۳/۱۷۹-۱۸۰)

قرآنِ کریم میں ایک دوسرے مقام پر اس روش سے متعلق ان سے بھی سخت الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے۔ ارشاد ہے "جو لوگ بخل کرتے ہیں، اور لوگوں کو بھی ایسی روش اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں یا ایسے قوانین مرتب کرتے ہیں جن کی رُو سے اس قسم کی انفرادی مفاد پرستی جائز قرار پائے، ان کے لئے ذلت آمیز تباہی ہوگی" (۴/۳۷-۳۸)، (۵۷/۲۴)

اور پھر مزید فرمایا "جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت خود اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔ جو قوم ایسی روش کو معاشرے کا جزو بنا لیتی ہے۔ تباہ ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے جس کی روش زندگی اس قسم کی نہیں ہوتی" (۴۷/۳۸) اسی لئے "بقا اسی قوم یا نظام کو حاصل ہوتی ہے، جو تمام نوعِ انسان کی نفع بخشی کی ضمانت دے" (۱۳/۱۷)۔

جنہیں دیا جاتا ہے، ان سے اس کا بدلہ تو ایک طرف، شکریہ تک کی بھی تمنا نہیں کرنی چاہیئے۔ انفاق اپنا بدلہ آپ ہوتا ہے۔ یعنی اس سے انسان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور نظامِ خداوندی کا قیام و استحکام۔ اس نظام کی برکات سے ہمیں ایسا معاشرہ نصیب ہوتا ہے۔ کہ جس میں لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ (۳۵/۳۵) نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے اور نہ ذہنی کاوش اور نفسیاتی افسردگی۔ فلہٰذا، آپ ڈاکٹر ہیں، وکیل، پروفیسر یا محنت کش غرضیکہ آپ زندگی کے جس شعبے سے بھی تعلق رکھتے ہیں، اپنا مال، اپنی محنت، وقت اور صلاحیت اس تحریک کے فروغ کے لئے وقف کر دیجئے۔ یہ ایک فکری تحریک ہے اور فکر کی تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اغراض و مقاصد کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کی جائے۔ اس ادارے کے اربابِ نظم و نسق قرآنی بصیرت سے سرشار، نہایت ایثار و خلوص کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں۔ لیکن جب تک ان کے پاس وسائل نہیں ہوں گے ان کا محض ایثار و خلوص کوئی نمایاں اثر پیدا نہیں کرے گا۔ ہم وابستگانِ فکرِ قرآنی کا اوّلین فریضہ بنتا ہے کہ ہم ہر طرح سے ان کی اعانت کریں۔ آپ کی دولت کا ایک ایک پیسا اور آپ کے وقت کا ایک ایک ثانیہ اس نظام کے قیام کو قریب سے قریب تر لاتا جائے گا۔

اس وقت اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ حضرتِ ملّا ہے۔ یہ ہامانی جنود کا سپاہِ بے کلاہ، عقل و دانش سے عاری، روایات کی دلدل میں دھنسا ہر منبر و محراب پر دینِ حق کا پرچار کرنے والوں پر

(بقیہ بر صفحہ ۱۵)

محمد عمر دراز

سردار عبدالقیوم کی بانیانِ پاکستان علیہم الرحمۃ پر بے جا تنقید!

خطباب ناروے کے حوالہ سے، سردار عبدالقیوم، صدر آزاد کشمیر، کا سلسلۂ مضامین، مؤقر روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۳ مارچ ۱۹۸۸ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء تک کی اشاعتوں میں شائع ہوتا رہا۔ اسی سلسلہ میں محترم ڈاکٹر محمود عباس بخاری صاحب کا مضمون بھی نظر سے گزرا۔

ہمارے نزدیک سردار صاحب کی حیثیت ایک سلطانی گواہ سے زیادہ کچھ نہیں جو اپنی ذاتی مصلحتوں کے تحت اپنی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ سلطانی گواہ کو انگریزی میں APPROVER کہا جاتا ہے اور APPROVER کی جو تعریف، قانون کی زبان میں ہے۔ قابلِ ملاحظہ ہے

AN APPROVER IS A MAN OF THE WEAKEST MORAL FIBRE WHO THROWS HIS ERSTWHILE COMPANIONS TO WOLVES TO SAVE HIS OWN SKIN.

ہم ان کے مضامین کو چنداں اہمیت نہ دیتے لیکن انہوں نے جس انتہائی مبالغہ اور غلط بیانی سے کام لیا ہے اُس سے نہایت غلط اثرات مرتب ہونے کا خدشہ ہے اور یہی جذبہ ہے اِن سطور کی تسوید کا۔

نہ جانے، سردار صاحب ہمارے زمانے کے عظیم ترین مفکرِ اسلام اور تصورِ پاکستان کے خالق، حضرت علامہ محمد اقبالؒ سے کس بنا پر، بقول ڈاکٹر محمود عباس بخاری صاحب، ایک خاص قسم کے عناد و تنقیص میں مبتلا ہیں، جو انہیں دیارِ غیر میں، حضرتِ علامہؒ کی شان میں گستاخی کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ کہاں سردار صاحب اور کہاں، ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا یہ منفرد نقیبؒ:

چہ نسبتِ خاک را با عالم پاک!

اس کے ساتھ ہی سردار صاحب نے قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کو بھی نہیں بخشا، جو عظیم ملی اور سیاسی مفکر اور بانیٔ پاکستان ہیں اور جنہیں نہ صرف علامہ اقبالؒ کی پوری پوری تائید حاصل تھی بلکہ انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو جو خط قائدِ اعظمؒ کے نام لکھا وہ اس عظمت و احترام اور بلند مقام کا آئینہ دار ہے جو حضرتِ علامہؒ کے دل میں اُن کے لئے موجود تھا۔ علامہ اقبالؒ نے لکھا کہ:۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں

گزرتا ہوگا۔ (میرے اس تکرار و اصرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملت کو اپنی یہ اُمیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت ساحلِ مُراد تک لے جائیں گے۔"

مزید برآں، علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک دوست کے خط کے جواب میں (جس میں اُس نے حضرت علامہؒ کی صحت کی دُعا کی تھی) ۱۹۳۵ء میں لکھا:۔

"میرا وقت پُورا ہو چکا اور میرا پیغام ملت تک مکمل صورت میں پہنچ چکا ہے۔ میرے لئے صحت کی دعا مانگنے کی بجائے آپ قائدِ اعظم محمد علی جناح اور کمال اتاترک کے لئے درازیٔ عمر کی دُعا کیجئے کہ انہیں ابھی اپنا مشن پورا کرنا ہے۔"

(مارچ ۱۹۴۰ء میں، بزم اقبالؒ کے سالانہ اجلاس میں سر عبدالقادر مرحوم نے اس خط کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے تھے۔ بحوالہ نوائے وقت مورخہ ۹ مارچ ۱۹۷۷ء)

اور قائداعظم علیہ الرحمۃ کے نزدیک حضرت علامہ اقبالؒ کا کیا مقام تھا، اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے ۱۹۴۱ء میں یوم اقبالؒ پر ارزاں فرمائی۔ قائداعظمؒ نے فرمایا:۔

"اگر میں اس تقریب (یوم اقبالؒ) میں شامل نہ ہوتا تو اپنی ذات کے ساتھ بڑی بے انصافی کرتا۔ میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جلسہ میں شریک ہو کر اقبالؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ اقبالؒ کی ادبی شہرت عالم گیر ہے کہ وہ مشرق کے بہت بڑے بلند پایہ شاعر اور مفکرِ اعظم تھے۔ مرحوم دورِ حاضر میں اسلام کی تاریخ تھے۔ **اس زمانہ میں اقبالؒ سے بہتر اسلام کسی اور شخص نے نہیں سمجھا۔** مجھے فخر ہے کہ میں نے اُن کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے۔ میں نے اُن سے زیادہ وفادار اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔ جس بات کو وہ صحیح خیال کرتے، یقیناً وہ صحیح ہوتی اور وہ اس پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتے تھے۔" (ہفتہ وار حمایت اسلام ۴ مارچ ۱۹۴۱ء)

سردار صاحب نے چاند پر تھوکنے کی کوشش میں اپنے ہی چہرہ کو اس تھوک سے آلودہ کیا ہے جب وہ ہمارے ان دو عظیم ترین رہنماؤں کے بارے میں یہ کہتے ہیں:۔

"جہاں تک پاکستان کے اجتماعی نظام کا تعلق ہے، اس میں ان دو حضرات کو ملوث کرنا چند وجوہات کی بنا پر درست نہیں۔ ایک تو یہ کہ ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی دو ٹوک

اور واضح بات ان معنوں میں نہیں کہی جسے آجکل کی مروجہ سیاسی اصطلاحات میں اسلامی یا سیکولر کہتے ہیں۔" (سردار صاحب کا مضمون قسط ۲، مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور ۳ مارچ ۱۹۸۸ء)

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے ہم سردار صاحب کی خود فریبی کہیں یا ابلہ فریبی کہ انہیں ان دونوں رہنماؤں کے بے شمار بیانات میں کوئی ایسی دوٹوک اور واضح بات نظر نہیں آئی جسے آجکل کی مروجہ سیاسی اصطلاحات میں اسلامی یا سیکولر کہا جا سکے۔ ہم سردار صاحب کو بتاتے ہیں کہ ان دونوں عظیم ترین رہنماؤں نے، کہ جن کے فکر و عمل کے نتیجہ میں آج ہمارا شمار آزاد قوموں میں ہوتا ہے، کس طرح غیر مبہم الفاظ میں بار بار کہا کہ وہ پاکستان کا حصول اس لئے چاہتے ہیں کہ اس میں اسلامی نظام (قرآن کریم کے قوانین و احکام و اقدار) کا نفاذ ممکن ہو سکے گا۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

"ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام، بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے..... مجھے کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے..... میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے..... مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم ازکم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔"

اس مملکت کے قیام سے ہو گا کیا؟ فرمایا کہ:۔

"اس سے اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ اُن اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی رُوح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔"

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے خطبات تشکیلِ جدید (کے چھٹے خطبے) میں سعید حلیم پاشا کی ہمنوائی میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:۔

"اندریں حالات ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے اور حریت، سالمیت

اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کا تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔"

ہم سردار صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ کیا انہیں، حضرت علامہ اقبالؒ کے مندرجہ بالا ارشادات میں کوئی ایسی دوٹوک اور واضح بات دکھائی دی ہے یا نہیں جسے آج کل کی مروّجہ سیاسی اصطلاحات میں اسلامی کہا جا سکے؟ اگر نہیں تو اس سے زیادہ کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ:-

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

اور آیئے اب آپ کو دکھایا جائے کہ علامہ اقبالؒ کے بعد، قائدِ اعظمؒ نے بھی اپنی سیاسی زندگی میں کوئی واضح اور دوٹوک ایسی بات کہی ہے یا نہیں جسے آپ کی سیاسی اصطلاح میں اسلامی کہا جا سکے؟

قراردادِ پاکستان کو قومی نصب العین کی صورت اختیار کئے ابھی ڈیڑھ سال نہیں گزرا تھا کہ اگست ۱۹۴۱ء میں، حضرت قائدِ اعظمؒ حیدر آباد تشریف لے گئے اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا نے انسے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران، طلباء نے قائدِ اعظمؒ سے بڑے اہم اور بنیادی سوالات کئے جن کے جوابات قائدِ اعظم نے ایسے متعین، دوٹوک اور نکھرے ہوئے انداز میں دیئے کہ مملکتِ پاکستان کے حصول کا منشاء و مقصود پوری طرح واضح ہو کر سامنے آگیا۔ اورینٹ پریس کے نمائندے نے اس ملاقات کی جو رپورٹ مرتب کی، اس کے ضروری حصے سوالات و جوابات کی صورت میں درجِ ذیل ہیں:-

سوال:- مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:- جب میں انگریزی میں مذہب 'RELIGION' کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک، مذہب کا یہ محدود اور مقیّد مفہوم یا تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآنِ مجید اور قوانینِ اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصول ہدایات اور طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہے بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

قائدِ اعظمؒ کا اپنے متعلق اعتراف و اعلان یہ ہے کہ "میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت [illegible] ہے"۔ لیکن اسلامی نظام کی اصل و بنیاد کے متعلق جو کچھ انہوں نے سمجھا اور کہا ہے، غور کیجئے کہ دینیات میں [illegible]یت کے مدعی کتنے ہیں جو اسلام کے متعلق اس گہرائی تک پہنچ سکے ہیں۔ (سردار صاحب بھی اس آئینہ میں [illegible]پنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کریں)۔

سِرِّ خدا کہ زاہد و عابد بکس نہ گفت
در حیرتم کہ دُردکشاں از کجا شنید؟

طلبہؓ نے دوسرا سوال یہ کیا کہ:۔
سوال: اس سلسلے میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟
جواب: اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، درحقیقت اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمّل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔

اور اب آیئے اس سوال کی طرف، جس کا موضوع، اس سارے سلسلہ میں مقطع کا بند ہے اور حیرت ہے کہ سردار صاحب جیسے دبزعمِ خویش، سیاسی اور دینی بصیرت کے مالک کو، قائدِ اعظمؒ کے ارشادات میں یہ کیوں نظر نہیں آیا۔ دراصل کورِ مادر زاد، آفتاب سے کچھ بھی کسبِ ضیاء نہیں کر سکتا۔

سوال: جس اسلامی مملکت کے حصول کے لئے آپ کوشاں ہیں، اس کے تصوّر کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟
جواب: اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے، جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ ہی کسی اور شخص یا ادارہ کی، قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں، ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے، حضرت علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کا تصوّر دیا۔ اور مسلمانانِ ہند کے قائدِ اعظمؒ حضرت محمد علی جناح نے اپنا خونِ جگر دے کر اس اسلامی مملکت "پاکستان" کو حاصل کیا۔

ہم بارِ دگر سردار صاحب سے استفسار کرتے ہیں کہ کیا عمر بھر اُن کی نظروں سے قائدِ اعظمؒ کے یہ ارشادات گزرے ہیں یا نہیں۔ اگر گزرے ہیں تو کیا انہیں آج کی مروجہ سیاسی اصطلاح میں پاکستان کے نظامِ حکومت کے لئے، دوٹوک اور واضح الفاظ میں اسلامی کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر قائدِ اعظمؒ کے یہ ارشادات اُن

کی نظروں سے پہلے نہیں گزرے تو اس میں اُن کی بصارت کا قصور ہے۔ اس میں اُس آفتابِ عالمتاب کا تو کوئی جرم نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب سردار عبدالقیوم جیسے بونے، اسلامیانِ ہند و پاکستان کے ان عظیم ترین رہنماؤں کو اپنی اوچھی اور گھٹیا تنقید کا ہدف بناتے ہیں تو اس سے ان کا اپنا ہی قد اور بھی چھوٹا ہو جاتا ہے اور اُن بلند ترین قامت کے رہنماؤں کی عظمت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کے وہ ہزاروں لاکھوں افراد جو سردار صاحب کو ایک اچھا آدمی سمجھتے تھے، اُن کے ان مباحث کے بعد، اُن سے نفرت کرتے ہیں جن کے ذریعے سردار صاحب نے پاکستان کے محبوب ترین رہنماؤں کے دامن ہائے عزّت و احترام کو داغدار کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے۔ اور اب تک سردار صاحب کو اس کا خاصا تجربہ ہو گیا ہو گا۔ ممکن ہے وہ بیان بازی کی مولویانہ روایت کو ترک کر کے توبہ کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہوں۔

سردار صاحب نے تحریکِ حصولِ پاکستان کی تیسری عظیم شخصیت محترم پرویزؒ صاحب کو بھی بلا مقصد اور بلا تعلق اپنے دلی حسد اور بغض نکالنے کا ہدف بنایا ہے۔ کہتے ہیں کہ سردار صاحب، صدرِ مملکت جناب ضیاء الحق صاحب کے قریبی دوست ہیں اور ان کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اس کا اعتراف انہوں نے خود بھی [illegible] کیا ہے۔ ہم سردار صاحب کو، محترم صدرِ مملکت کے، محترم پرویزؒ صاحب کے متعلق خیالات سے بھی روشناس کرائے دیتے ہیں کہ شاید انہیں اسی سے حیا آ جائے۔ ان خیالات کا اظہار، صدرِ مملکت صاحب نے اپنے اس تعزیتی پیغام میں کیا تھا جو انہوں نے محترم پرویزؒ صاحب کی وفات پر اُن کی بیوہ محترمہ کے نام ارسال کیا تھا۔ محترم صدرِ مملکت نے کہا تھا کہ:-

"آپ کے شوہر علامہ غلام احمد پرویز کی المناک وفات پر مجھے دلی صدمہ ہوا ہے۔ براہِ کرم میری تعزیت قبول فرمائیے۔

علامہ پرویز کو تحریکِ پاکستان کے لئے کام کرنے کا اعزاز حاصل تھا۔ جس دوران انہوں نے قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کے خیالات و نظریات سے استفادہ کیا۔ بعد میں انہوں نے اپنی زندگی اسلام کے مطالعہ کے لئے وقف کر دی اور اسلام کی تشریح و تعبیر اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں کے مطابق کی۔ اس سلسلے میں اُن کے بہت سے پیروکار ہیں۔

علامہ پرویز کو قدرت نے زورِ قلم سے نوازا تھا جسے انہوں نے اپنے نظریات کو نہایت پُراثر انداز میں تفصیلاً پیش کرنے کے لئے کامیابی سے استعمال کیا۔ تحریکِ پاکستان کے ایک مخلص کارکن اور ایک عظیم و منفرد عالم کی حیثیت سے وہ مدتوں یاد رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے نوازے اور آپ کو یہ نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ بخشے"
...احب۔ یہ ہے اُس عظیم و منفرد مفکرِ قرآن کا مقام آپ کے دوست اور مربّی، صدر مملکت پاکستان جنرل ...یاء الحق کے نزدیک، جسے آپ برِصغیر ہندو پاکستان کے فتنوں میں سے نمایاں خدوخال کے طور پر ...لتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کم ازکم اپنے اس قریبی دوست اور محسن کے جذبات و احساسات کا ہی آپ نے ...یک ہوتا۔

محترم پرویز صاحب کے دو ایسے جرم ہیں جن کی بنا پر ہندو پاکستان کے مُلّا انہیں ہمیشہ اپنی تنقید و ...ف بنائے رہتے ہیں۔ محترم پرویز صاحب کو ان دونوں جرائم کے ارتکاب پر ناز تھا۔ اور وہ یہ ہیں :-

...۔ تحریکِ حصولِ پاکستان کے دوران، قال اللہ اور قال الرسولؐ کے نام پر اس تحریک کی مخالفت کرنے والے علماء کی مذموم سازشوں کو، حضرت قائدِ اعظمؒ کی زیرِ قیادت، بے نقاب کرنے اور حصولِ پاکستان کی دینی اور ملی اہمیت کو نمایاں کرنے کے محاذ کی سربراہی کے فریضہ کی کامیاب سرانجام دہی۔ اس جنگ میں علماء کو شکستِ فاش ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضرت قائدِ اعظمؒ اور محترم پرویزؒ صاحب کامیاب و کامران نکلے اور ان اصحاب کی زیرِ قیادت، ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی مساعی کا ثمر پاکستان کی صورت میں دنیا کے نقشہ پر اُبھرا۔ چنانچہ محترم پرویز صاحب کے خلاف سارا مذہبی پراپیگنڈہ اسی شکستِ پندار کا انتقام ہے۔

ثانیاً۔ محترم پرویزؒ صاحب، علامہ اقبالؒ کے ارشاد کے مطابق، ساری عمر، آئینہ اسلام پر سے غیر اسلامی زنگ کی اُن سخت اور درشت تہوں کو کھرچ کھرچ کر اُتارتے رہے جنہیں یہ مذہبی علماء مزید سخت اور درشت کرنے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کرتے رہتے ہیں۔

سردار صاحب، آغا شورش کاشمیری مرحوم کے نام سے تو یقیناً واقف ہوں گے۔ مرحوم آغا صاحب کی ...دیانیت کے خلاف خدمات سے کون سا پاکستانی واقف نہیں ۔ ہم سردار صاحب کو، آغا صاحب مرحوم کے محترم پرویزؒ صاحب کے بارے میں اُن خیالات سے آگاہی کراتے ہیں جو انہوں نے محترم پرویزؒ صاحب کی سیرتِ فاروقِ اعظمؓ پر معرکہ آرا تصنیف و شاہکارِ رسالتؐ، کا صرف آخری باب بہ عنوان، ...ۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد، پڑھنے کے بعد، ہفت روزہ چٹان میں شائع کئے تھے انہیں ...یے اور فیصلہ کیجئے کہ محترم پرویزؒ صاحب برِصغیر ہندو پاکستان کے فتنوں میں سے ایک ہیں یا "افکارِ اسلام ...ربلا میں حسینی قافلہ کی ایک آواز" ؟

آغا صاحب مرحوم نے اپنے تبصرہ میں علامہ اقبالؒ کے ارشادات سے مختلف اقتباسات پیش

کرنے کے بعد لکھا ہے :-

"محولہ بالا اشارات (اقتباسات) کا اقتضاء تھا کہ دانشورانِ اقبالؒ اس موضوع پر قلم اٹھاتے اور اسلامیات کی تاریخ میں عجمی اثرات کا جائزہ لیتے لیکن کسی اقبالی نے اس پر غور نہیں کیا، نہ اس طرف توجہ کی اور نہ مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ کے راستہ کی اس سب سے بڑی روک کو دور کیا۔ اغلب خیال ہے کہ وہ اس کے اہل ہی نہ تھے۔ اور ایک دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ ان کی روپہلی اور طلائی مصلحتوں میں اس کا حوصلہ نہ تھا۔

دو روز پہلے مولانا تاج محمود (لائل پور) کی معیت میں ایک فاضل دوست سے ملاقات ہوئی تو وہاں دورانِ گفتگو اسلامیات میں عجمی اثرات کا ذکر آ گیا۔ اس دوست نے جناب غلام احمد پرویزؒ کی تازہ کتاب شاہکارِ رسالتؐ (عمر فاروقؓ) کا ذکر کیا کہ اس کا مطالعہ ہر علم دوست کا فرض ہے۔ اقبالؒ نے جس عجمی سازش کو خطوط و خطبات میں اشارۃً بیان کیا، شاہکارِ رسالتؐ اس کا تفصیلی مرقع ہے۔ بڑے سائز کے ۵۲۸ صفحات کی اس کتاب میں چودھواں باب (بہ عنوان، شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد) کے تقریباً سو صفحات عجمی سازش کی تفصیلات سے متعلق کئی ہزار تاریخی صفحات کا نچوڑ ہیں۔ اس جامع باب کو ایک جامع کتاب کی خصوصیت حاصل ہے۔ ہر عنوان کے تحت اُس کی تفصیل موجود ہے۔ کوئی سی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ اگر کوئی سوال ذہن میں اُبھرتا ہے تو اس کا جواب انہی مباحث میں نکل آتا ہے۔ حتیٰ کہ مطالعاتی طبیعت بھی کوئی نہ کوئی نیا نکتہ حاصل کر پاتی ہے۔

آغا صاحب مرحوم مزید لکھتے ہیں کہ چودھویں باب کے مطالعہ سے فارغ ہو کر راقم نے محسوس کیا کہ :-

۱۔ پرویزؒ نے عجم سے متعلق، اقبالؒ کی ذہنی تگ و دو کو اپنے قلم کی معرفت حقائق و معارف کے تاریخی سانچہ میں ڈھالا۔ اور اندھیروں کو اُجالوں سے متعارف کیا ہے۔

۲۔ کتاب کے متعلق جیسا کہ عرض کیا قبل از مطالعہ رائے دینا مشکل ہے۔ انشاء اللہ یہ فرض بھی جلد ادا ہو گا۔ لیکن چودھواں باب تاریخ اسلام کی سیاسی و علمی مصائب کی ایک تجزیاتی کہانی اور فی الجملہ عجم کے ہاتھوں اسلام پر کیا گزری کی روداد ہے۔

۳۔ ہو سکتا ہے کسی دائرے میں یا کسی پہلو سے بعض اکابر علماء اور محقق فضلاء کو اساسی یا جزوی اختلاف ہو لیکن راقم نے پرویزؒ سے متعلق اپنے متعارف نظریے میں، جو علمائے کرام کے فتوے کی بدولت ذہن پر نقش تھا، ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کی۔ فی الجملہ پرویزؒ صاحب اپنی سیاسی

وہ شخصی عصبیتوں کے باوجود، اسلام کے تاریخی ذہن سے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ پر سوچتے ہیں۔ ان کے دل میں سرگزشتِ اسلام کی ویرانیوں پر شدید ہلچل ہے اور وہ مسلمانوں کی نئی پود کے ذہنی اضطراب کو دُور کرنے کے لئے عصری افکار کے لہجہ میں اسلام کی اساس پر اُن سے ہمکلام ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں آغا صاحب مرحوم، شاہکارِ رسالتؐ کے ابواب کی تفصیل دینے کے بعد کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ بھی کئی ایک عنوان ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انسان ان کے مطالعہ سے علم و تاریخ کی صداقتوں سے متمتع ہوتا ہے۔

۵۔ پرویز صاحب سے متعلق دینی حلقوں میں تسلسل و تواتر سے یہ فضا قائم رہی ہے کہ وہ منکرِ حدیث ہیں، لیکن جن شگفتہ الفاظ میں، انہوں نے اپنے عقیدہ کی صراحت کی ہے اس کے بعد معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد آغا صاحب مرحوم علماء سے استفسار کرتے ہیں کہ اگر امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، اور امام نسائیؒ نے اُن لاکھوں احادیث کے خزانہ میں سے، جو انہیں ملا، کانٹ چھانٹ کر کے صرف چند ہزار احادیث اپنے مجموعوں میں شامل کیں تو پرویز صاحب کی چھنگھاڑ اس الزام میں کہ وہ احادیث تسلیم نہیں کرتے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ انہوں نے لکھا ہے کہ پرویز اُن احادیث کو واقعی تسلیم نہیں کرتے جو قرآنِ پاک کی تعلیمات کے خلاف ہیں اور جنہیں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے کوئی سی نسبت نہیں۔

۶۔ پرویز صاحب نے اس باب میں اپنے عقیدہ کی وضاحت کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"میں نہ سنّی ہوں نہ شیعہ۔ میرا تعلق کسی بھی فرقہ سے نہیں۔ قرآنِ کریم کا طالب علم ہوں۔ اور میرا عقیدہ بلکہ ایمان ہے کہ خدا کی یہ کتابِ عظیم دین میں سند و حجت ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا واحد معیار۔ کوئی عقیدہ، نظریہ، تصوّر، مسلک، مشرب جو اس کے خلاف جاتا ہے، میرے نزدیک درست نہیں، خواہ اس کی نسبت کسی طرف بھی منسوب کیوں نہ کی گئی ہو۔ اگر اس قسم کا کوئی عقیدہ بزرگانِ سلف میں سے کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، خواہ اُن کا تعلق کسی فرقے سے ہو، تو اُن حضرات کے احترام کے پیشِ نظر میں یہی کہتا ہوں کہ ان کی طرف اس کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی، انہوں نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔" (ص ۳۴۶)

ان الفاظ کے بعد پرویز صاحب کی شرعی چنگھاڑ لائقِ اعتناء نہیں رہتی۔ ایک مسلمان کے لئے

قرآن کے مقابلہ میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا مختلف المعنی قول حجت نہیں بلکہ اس سے اباء ہر مسلمان کا فرض ہے۔

اس کے بعد آغا شورش کاشمیری مرحوم نے لکھا ہے کہ "ایڈیٹر چٹان کو آج تک جناب غلام احمد پرویز سے ذاتی نیاز حاصل نہیں ہو سکا، کبھی اُن سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن اُن کی عظیم کتاب شاہکار رسالت" پڑھنے کے بعد ایڈیٹر چٹان کو یقین ہو چکا ہے کہ اپنی اس کتاب کی بدولت پرویز بارگاہِ رسالت میں سرخرو ہو کر باریاب ہوں گے۔ اور یہ کتاب اُن کے لئے توشۂ آخرت ثابت ہو گی۔ اللہ تعالےٰ اُن فضلاء کے ساتھ اُنہیں جگہ دیں گے جن کے دل اسلام کے لئے ہر دور میں دھڑکتے رہے ہیں۔ غلطیاں ہر انسان سے ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ صلحائے اُمت کے نزدیک کسی مقام پر اُن کے قلم کو ٹھوکر لگی ہو، آخر وہ ایک انسان ہیں۔ لیکن اُنکے سچا مسلمان ہونے میں کوئی شک نہیں۔ وہ قرآنی فکر کی ایک فاضل شخصیت ہیں۔ علماء سے دردمندانہ گزارش ہے کہ وہ محض فروعات کا شکار نہ ہوں۔ شاہکار رسالتؐ کا مطالعہ کریں۔ اور ضرور کریں۔ اُن کی بلند فکر کے نزدیک پرویز صاحب سے کبھی تفقہ فی الدین میں کوئی چوک ہوئی ہے تو انہیں محبت سے مطلع کریں تاکہ ایک سچا دل اپنی کوتاہی کا جائزہ لے سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرویزؒ بھی افکارِ اسلام کی کربلا میں حسینی قافلہ کی ایک آواز ہیں۔ علماء کو ان سے متعلق اپنا فتوےٰ واپس لینا چاہیئے۔

(چٹان مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۷۴ء)

سردار صاحب سنیئے! ایک حقیقت کا متلاشی قلبِ سلیم، محترم پرویزؒ صاحب کی ایک کتاب کا صرف ایک باب پڑھنے کے بعد کیا محسوس کرتا ہے؟ ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی آغا شورش کاشمیری کی طرح، علماء کے فتویٰ کی وجہ سے محترم پرویزؒ صاحب کے متعلق مستعار نظریہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ خدا اگر توفیق دے تو آپ اُن کی اس کتاب (شاہکار رسالتؐ) اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر اُن کی بے نظیر کاوش "معراجِ انسانیت" (سیرتِ صاحب قرآنؐ خود قرآن کے آئینے میں) کا مطالعہ کیجئے کہ اس کتاب کا سرنامہ ہی محترم پرویزؒ صاحب نے یہ دیا ہے کہ:

آبروئے ما زِ نامِ مصطفےٰؐ است

اور جس کتاب میں انہوں نے ایک نہیں متعدد ایسی احادیث دی ہیں جو ہیروں کی طرح جگمگا رہی ہیں اور اپنے منہ سے کہہ رہی ہیں کہ وہ سرورِ کائنات علیہ التحیہ والسلام کے ارشاداتِ گرامی ہیں۔

آیئے ہم آپ کو محترم پرویزؒ صاحب کی اس کتاب سے ایک اقتباس دکھاتے چلیں جس سے انتہائے احترام و عقیدت جھلک رہی ہے:۔

یہ آنے والا رسولؐ کافۃً للناس اور رحمۃً للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل ہے۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی، اُسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی، وہ اُسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوئیؐ میں اُتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی، وہ لالہ ویاسمن کی ان ہی پتیوں کی رہنِ منّت تھی جن کا گلدستہ اس نبئ آخر الزماںؐ کے مقدّس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا اور مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذرّاتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو اُن کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ تھے، یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں، یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے، یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملّت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداء است
رحمۃ للعالمینی انتہا است

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا، آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے، وہ اپنی انتہائی شکل میں دیے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کیلئے کسی دوسری مشعلِ راہ اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اُس ذاتِ اقدس واعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ :-

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دَیر بحق، دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

یہ تھا حاصلِ بہارِ چمنِ کائنات، کہ جس کا ظہور صبحِ کائنات تھا۔

وُہ رازِ خلقتِ ہستی، وہ معنیٔ کونین
وُہ جانِ حُسنِ ازل، وُہ بہارِ صُبحِ وجود
وُہ آفتابِ حرم، نازنینِ کُنجِ حرا
وُہ دِل کا نُور، وہ اربابِ درد کا مقصود
وُہ سرورِ دوجہاں، وہ محمدِ عربی
بروحِ اعظم وپاکش، درود لامحدود

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ ۳۳/۵۶

(معراجِ انسانیت۔ صـ۷۵-۷۴)

سردار صاحب! یہ ہے اُس شخص (محترم پرویز صاحب) کے نزدیک مقامِ حضور ختم المرسلین علیہ التحیۃ والسلام کا۔ ایمانداری سے بتائیے کیا آپ نے اپنی زندگی میں اُن کی یہ کتابیں دیکھی بھی ہیں؟

اور آپ نے جس شخص کو قادیانیت وغیرہم سے ہم قوس کیا ہے، ہم آپ کو بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ وُہی شخص ہے جس کی مقامِ نبوّت کی وضاحت وتعبیر کو بُنیاد بنا کر، برِصغیر ہندو پاک میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا پہلا عدالتی فیصلہ دیا گیا تھا۔ اگر آپ کو علم نہ ہو تو جان لیجئے کہ وہ مقدمہ بہاولپور کے نام سے مشہور ہے اور اس کا فیصلہ ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو سنایا گیا تھا۔ یہ فیصلہ اپنی شہرت اور اہمیت کے پیشِ نظر اس زمانے میں بھی الگ چھپ گیا تھا اور اس کے بعد بھی چھپتا رہا۔ ہم جس نسخہ کا حوالہ دے رہے ہیں وہ محفلِ ارشادیہ سیالکوٹ کی طرف سے جون ۱۹۷۳ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ۱۹۲۶ء میں بہاولپور ریاست کی ایک عدالت میں ایک مسلمان خاتون نے مقدمہ دائر کیا کہ اُس کا خاوند قادیانی مسلک اختیار کر کے مُرتد ہو چکا ہے۔ اس لئے اُس شخص کا نکاح مدّعیہ سے فسخ قرار دیا جائے۔ یہ مقدمہ نو (۹) سال تک عدالت میں چلتا رہا اور اس میں اس وقت کے بڑے بڑے جیّد علماء مدّعیہ کی طرف سے پیش ہوئے، مثلاً مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور، مولانا نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور، مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، اور مولانا سید انور شاہ صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند وغیرہم۔ اس سے اس مسئلہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ اس مسئلہ کا دارومدار اس بات پر

کہ نبوّت کی حقیقت کیا ہے اور نبی کسے کہتے ہیں۔ ڈسٹرکٹ جج محمد اکبر صاحب، بہاولپور نے لکھا ہے کہ پیش ہونے والے علماء نے جس قدر تعریفیں نبی اور رسول کی عدالت میں پیش کیں، وہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی نہ تھیں اور وہ اس جستجو میں رہے کہ نبی یا رسول کی کوئی ایسی تعریف مل جائے جو تصریحاتِ قرآن کی رُو سے تمام لوازمِ نبوّت پر حاوی ہو لیکن نبی کی کوئی جامع تعریف انہیں نہ مل سکی۔

"آخر کار ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان "میکینیکی اسلام" از جناب چودھری غلام احمد پرویز میری نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے مذہبِ اسلام کے متعلق آجکل کے روشن ضمیر طبقہ کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں نبوّت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے، میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں اُن کے الفاظ ہی میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں۔" (فیصلہ ص۱۰۱)

ازاں بعد انہوں نے محترم پرویزؒ صاحب کے اُس مضمون سے خاصا مفصل اقتباس درج کیا اور نبی کی جو تعریف محترم پرویزؒ صاحب نے پیش کی تھی، اس پر مبنی بحث کے بعد اپنے فیصلہ میں کہا:-

"مدعا علیہ، قادیانی عقائد اختیار کر لے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے، لہٰذا اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخ ارتدادِ مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے۔" (فیصلہ ص۱۸۳)

سردار صاحب، یہ ہیں محترم پرویزؒ صاحب، جو مقامِ نبوّت کو اس طرح اُبھار اور نکھار کر وضاحت سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ایک قانون دان، جو ہندوستان کے اس وقت کے تمام جیّد علماء کے بیانات سے اسے (مقامِ نبوّت کو) نہ سمجھ سکا، اور مقدمہ کا فیصلہ نہ کر سکا، وہ محترم پرویزؒ صاحب کے ایک ایسے مضمون سے جس کا موضوعِ زیرِ بحث سے براہِ راست تعلق بھی نہ تھا، مقامِ نبوّت کو ایسی اُجلی، نکھری اور واضح شکل میں دیکھ پایا کہ بلا تردّد اُس نے فیصلہ دے دیا کہ قادیانی عقائد اختیار کرنے والا مرتد ہو جاتا ہے۔ جو شخص اس انداز میں مقامِ نبوّت کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ آپ کے نزدیک، برِصغیر ہند و پاک میں فتنہ کا باعث ہے۔

جنوں کا نام خرد رکھ دیا، خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

ذرا تقابل کیجئے کہ آپ کہاں ہیں اور قائدینِ تحریکِ پاکستان، حضرت علّامہ اقبالؒ، حضرت قائدِاعظم محمد علی جناحؒ اور محترم پرویزؒ صاحب کہاں؟ آپ تو اِن حضرات کی خاکِ پا بھی نہیں۔

آخر میں ہم آپ کو ایک اور وجہ بھی بتاتے چلیں جس کی بنا پر علماءِ پاکستان اور ہندوستان محترم پرویز صاحب کی مخالفت کرتے چلے آرہے ہیں۔ اسے ہفت روزہ شہاب نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۶۷ء میں لکھا تھا اور وہ یہ ہے کہ:-

"علماء، پاکستان کے جس تصوّر کی مخالفت کرتے تھے، وہ وہی تصوّر تھا جسے محترم پرویز صاحب اور ان کے کچھ ساتھی پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں"

باقی رہا معاملہ آپ کا اور ڈاکٹر جاوید اقبال کا، تو ہماری نظر میں ڈاکٹر جاوید اقبال، اپنے والد ماجد اور دنیائے اسلام کے عظیم ترین مفکّر اور تصوّرِ پاکستان کے خالق حضرت علامہ محمد اقبالؒ کی تعلیماتِ قرآنی کے متعلق جو کچھ کہتے پھر رہے ہیں، اگر یہ سب کچھ علامہ اقبالؒ کی زندگی میں اُن کے سامنے آجاتا تو وہ اسے کبھی برداشت نہ کر پاتے۔ بہتر ہوتا کہ ڈاکٹر جاوید اقبال، علامہ اقبالؒ کی قرآنی تعلیمات پر اظہارِ خیال کرنے کی بجائے اپنے فرائضِ منصبی کی طرف توجہ دیتے۔ اس سے کم از کم وہ ان سازشوں کا حصّہ تو نہ بنتے جو علامہ اقبالؒ کو اُن کے مقامِ بلند سے گرانے کے لئے، سردار عبدالقیوم جیسے غیر متعلق شخص اور ہمارے (بزعمِ خویش) علماءِ کرام کی طرف سے کی جارہی ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی اپنے عظیم والد سے کوئی علمی نسبت نہیں۔

اور آخر میں ہم سردار عبدالقیوم صاحب سے مؤدّبانہ گزارش کریں گے کہ آپ علامہ اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ محترم پرویزؒ صاحب اور ہمارے پاکستان کی فکر نہ کیجئے اور اپنا وقت اور توانائیاں اتنے لمبے لمبے بے مقصد مضامین لکھنے میں ضائع کرنے کی بجائے، آزاد کشمیر اور اس کے عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کریں (اگر آپ میں ایسا کرنے کی صلاحیت موجود ہے تو!)۔

(بقیہ حقائق و عبر)

۵۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

"اوکاڑہ (نمائندہ جنگ) شریعت آرڈی ننس کے نفاذ کے بعد اوکاڑہ کے ایک امام مسجد و خطیب نے اپنی پسند کی دوسری شادی رچالی۔ بتایا جاتا ہے کہ مذکورہ امام مسجد کی پہلے گھر والوں نے خاندان میں شادی کی اور اس کے دو بچے ہیں۔ بعد میں شریعت آرڈی ننس کے نفاذ کے بعد اپنی من پسند لڑکی کے ساتھ نواحی گاؤں میں شادی کرلی جس کی اجازت نہ اپنی پہلی بیوی سے نہ لی اور نہ ہی اپنے خاندان والوں کی رضامندی لی۔ امام مسجد کا کہنا ہے کہ شریعت کے نفاذ کے بعد اسے کوئی اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ شادی سے قبل اپنی پہلی بیوی کو میکے بھیج دیا۔"

(روزنامہ جنگ ۵ جولائی ۱۹۸۸ء سے نقل)

محترمہ ثریا عندلیب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اقامتِ صلوٰۃ

"اَلصَّلٰوۃ" دینِ اسلام کا ایک بنیادی گوشہ ہے اور قرآن جس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اسے وہ اقامتِ صلوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

صلوٰۃ کے معنی اپنے مادہ (ص-ل-و) کے اعتبار سے کسی کے پیچھے پیچھے چلتے جانا ہوتے ہیں چنانچہ عربی زبان کی مستند کتبِ لغت کی روشنی میں مفسرین نے اقامتِ صلوٰۃ کی قرآنی اصطلاح کا مفہوم قوانینِ الٰہیہ کے پیچھے پیچھے چلنا متعین کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وحیِ خداوندی کے عطا کردہ قوانین و احکام کی پابندی کرنا اور اس کے دیئے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا رہنا اقامتِ صلوٰۃ کہلاتا ہے اور قرآن کے نزدیک یہ اقامت یا قیام اجتماعی نظام کے تحت ہو سکتا ہے۔ وہ نظام جس میں افرادِ معاشرہ اپنے اپنے مفادات کے پیچھے بھاگنے کی بجائے، خدا کی کتاب قرآنِ کریم کے قوانین کی پیروی کرتے ہوئے اس کے متعین کردہ نصب العین کی طرف بڑھتے جائیں۔ اسی وجہ سے اقامتِ صلوٰۃ کو ایک اجتماعی فریضہ قرار دیا گیا ہے، اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ الصلوٰۃ کا قیام جماعتِ مومنین کے تمکن فی الارض یعنی انکی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ جیسا کہ سورہ الحج میں بتایا گیا ہے

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲/۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں تمکن فی الارض حاصل ہوگا یعنی ان کی اپنی مملکت قائم ہو گی (۲۴/۵۵) تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ معروف احکام نافذ کریں گے اور منکر سے روکیں گے۔"

اس آیۂ کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے لئے اپنی آزاد مملکت ہونے کی جو شرط رکھی گئی ہے تو اس کے لئے اس سے پورا ایک نظام مراد ہے نہ کہ صرف نماز پڑھ لینا اور مروجہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ دے دینا ظاہر ہے کہ یہ فرائض ہر حکومت میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔

سورۃ الشوریٰ میں اسلامی مملکت کی وضاحت اس فرمانِ ربی سے ہوتی ہے کہ

وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ وَمِمَّا

رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۴۲/۳۸)

"مومنین وہ ہیں جو خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں یعنی اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں اور اپنے تمام معاملات کو باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں اور جو رزق خدا نے انہیں دیا ہوتا ہے اسے نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کے لئے کھلا رکھتے ہیں"۔

یہاں اقامتِ صلوٰۃ کا امورِ مملکت کے لئے باہمی مشاورت کے ساتھ ذکر آیا ہے۔ یعنی الصلوٰۃ وہ نظامِ مملکت ہے جس میں تمام امورِ مملکت جماعتِ مومنین کے باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں اور جس کا بنیادی فریضہ نوعِ انسان کی ربوبیت ہے۔ سورہ اعراف میں کہا گیا ہے

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۷/۱۷۰)

"یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں اور یوں اقامتِ صلوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں"۔

اسلئے کہ اسلامی نظام کتاب اللہ کے قوانین و اقدار کے عملی نفاذ کا نام ہے۔ اس مقصد کی مزید وضاحت کے لئے قرآن کریم میں صَلّٰی کے مقابلہ میں تَوَلّٰی کا لفظ آیا ہے (۷۵/۳۱) تَوَلّٰی کے معنی ہیں صحیح راستے سے روگردانی کرنا۔ گریز کی راہیں نکالنا۔ منہ موڑ لینا۔ اور صَلّٰی کے معنی قوانینِ خداوندی کے مطابق صحیح راستے پر چلتے جانا۔ نظامِ خداوندی کے متعین کردہ فرائضِ منصبی کو ادا کرتے جانا۔ اور ان فرائضِ منصبی کا دائرہ زندگی کے ہر گوشے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس دائرے کی وسعت ہمیں حضرت شعیبؑ کے ذکرِ جلیل میں روشن تر نظر آتی ہے۔ دیکھئے سورہ ہود میں کس ابدی حقیقت کا بیان ہوا ہے۔ جب حضرت شعیبؑ نے نبوت ملنے پر اپنی قوم کے سامنے دعوتِ خداوندی کو پیش کیا تو حسبِ معمول ان کی اس دعوت کو قوم نے رد کیا اور مخالفت پر اتر آئی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان افرادِ قوم سے کہا کہ میں صلوٰۃ کی آزادی چاہتا ہوں۔ اس پر وہ مذہب پرست قوم یہ سمجھی کہ حضرت شعیبؑ اپنے طور پر خدا کی پرستش کرنا چاہتے ہیں تو اس سے ہمیں کیا فرق پڑے گا، کرنے دو۔ لیکن انہیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ حضرت شعیبؑ کا صلوٰۃ کی آزادی سے مطلب کیا تھا، چنانچہ وہ بول اٹھے۔

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷)

"اے شعیب! یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنکی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آرہے ہیں اور یہ کہ ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی

مرضی کے مطابق صرف نہ کریں (ہم ایسی صلوٰۃ سے باز آئے)"

یہ بات سمجھنا کہ صلوٰۃ کا تعلق معاشیات سے بھی ہوتا ہے مذہب پرستی میں ممکن نہیں ہوتا کیونکہ مذہب خدا کی پرستش کرواتا ہے، اس کی محکومیت نہیں سکھاتا۔ مذہب میں دنیاوی معاملات کا "دینی عبادات" سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جبکہ الدین یا اقامتِ صلوٰۃ اپنی زندگی کے تمام معاملات کو وحیِ خداوندی کے تابع رکھنے کا نام ہے۔ چنانچہ مال و دولت کے استعمال کو جس کا تعلق زندگی کے بنیادی پہلو معیشت سے ہے، اس متابعت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر غور و خوض اور عقل و فہم سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دنیا میں جو ناہمواریاں اور فسادانگیزیاں پائی جاتی ہیں اور جو طبقاتی فرق اور اونچ نیچ ہمارے معاشروں میں رائج ہے، اس کا بنیادی سبب رائج الوقت معاشی نظام کی کجی ہے جس میں مال کی غلط تقسیم سے امیری اور غریبی کے عفریت جنم لیتے ہیں۔ اور سارا معاشرہ انتشار و خلفشار کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا اپنا معاشرہ اس کی واضح تصویر ہے اور یہ اس لئے کہ ہم نے اپنی معاشی زندگی کو الصلوٰۃ سے بالکل الگ کر رکھا ہے۔ اور حضرت شعیبؑ کی قوم کی طرح ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ بھلا یہ کیسی صلوٰۃ ہے جو ہمارے "نجی معاملات" میں دخیل ہو رہی ہے اور ہم اپنا روپیہ پیسہ، اپنی دولت اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں۔ یعنی اپنے مفادات کو ترجیح نہ دیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہم وحی سے آزاد اپنی عقلِ خود بیں سے ہزار اپنے افعال اور فیصلوں کے لئے جواز کی دلیلیں ڈھونڈتے رہیں۔ ہمارا باطل، حق پر کبھی غالب نہیں آسکتا۔ قرآن تو قرآن ہے۔ اللہ کی آخری کتابِ مبین جس کا ہر لفظ اپنی جگہ مستحکم اور اٹل ہے، دیکھئے سورہ الماعون میں صلوٰۃ اور معاشی نظام کا ان مٹ تعلق کس طرح نکھر اور ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ تکذیبِ دین کون کرتا ہے۔ فرمان ہوتا ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (۱۰۷/۱)

"تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے"

یہاں قرآن کی مراد اُن لوگوں سے ہے جو دین کے مدعی ہونے کے باوجود عملی طور پر دین کو جھٹلاتے ہیں۔ اس شکل میں کہ

فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۱۰۷/۲-۳)

"تکذیب دین کرنے والا وہ ہے کہ جو اس شخص کو جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے دھکے دیتا ہے۔ اور معذور لوگوں کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا"

دوسری جگہ ہے

وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۸۹/۱۸)

یعنی جو لوگ کام کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے (جن کی حرکت رُک جاتی تھی) تم ایسا انتظام نہیں کرتے تھے جس سے انہیں سامانِ زیست میسر آجائے۔

وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۸۹/۱۹)

"تم باپ دادا کی میراث ہڑپ کر جاتے تھے"۔

وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹/۲۰)

"اور چاہتے یہ تھے کہ ساری دنیا کی دولت سمٹ سمٹا کر تمہارے پاس جمع ہو جائے"۔

قرآن کریم نے ان مذکورہ آیات میں تکذیبِ دین کرنے والوں کی وضاحت دو ٹوک الفاظ میں کر دی ہے یہ وہ تلخ بلکہ سنگین حقیقت ہے اور ہمارے معاشرے کا ایسا نقشہ ہے جس سے انکار ہو نہیں سکتا۔ اس کے بعد سورہ ماعون کی چوتھی آیت میں اعلان ہوتا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (۱۰۷/۴)

"یہ وہ مُصلّین (نمازی) ہیں جنکی نمازیں ان کے لئے تباہی کا موجب بن جاتی ہیں"۔

کیونکہ :-

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۵-۷)

"یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کی مرئی اور محسوس حرکات کو ہی صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور اس کی روح، مقصد اور غرض و غایت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ نمازیں تو پڑھتے ہیں لیکن رواں دواں چشموں کی طرح بہنے والے رزق (جو تمام نوع انسان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لئے دیا گیا ہے) کے سامنے بند لگا کر اپنے لئے روک لیتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مُصلّین جن کی نمازان پر تباہی لاتی ہے اور یہی لوگ تکذیبِ دین کرتے ہیں"۔

قرآن میں دوسرے مقام پر حقیقی مُصلّین کی نشان دہی بھی کی گئی ہے تاکہ کسی قسم کا التباس پیدا نہ ہو۔ سورہ المعارج میں مال و دولت جمع کرنے والوں کی کیفیت۔ ان کا شعارِ زندگی ان کا طریقہ کار بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مصلّین یعنی الصلوٰۃ کی التزاماً پابندی کرنے والوں کا یہ رنگ ڈھنگ نہیں ہوتا۔ بلکہ

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (۷۰/۲۳-۲۶)

"یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کے مال و دولت میں ان لوگوں کا حق ہے جن کی ضروریات ان کی محنت کے ماحصل سے پوری نہیں ہوتیں۔ یا وہ بالکل معذور ہو جاتے ہیں یہی لوگ ہیں جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں"

یہاں حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ سائل و محروم اپنے حق کے طور پر سامانِ زیست صاحبانِ مال سے طلب کر سکتے ہیں۔ انفرادی زکوٰۃ اور خیرات ان کا مقدر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ دلوں میں جاگزیں کر لیا گیا ہے کہ ۲½ فیصد سالانہ زکوٰۃ دینا اور غریب غربا کو خیرات کرتے رہنا بڑی نیکی اور ثواب کا کام ہے۔ اور ضرورتمندوں بے چاروں کی تو قسمت ہی یہی ہے۔ الصلوٰۃ کے نظامِ قرآنی سے ایسے باطل اور گمراہ کن عقائد و تصورات کی گنجائش نہیں ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم اس نظامِ قرآنی کا قیام ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ کو اقدار و قوانینِ قرآنی کی پیروی کرنا ہو گی۔ لیکن قرآن میں صلوٰۃ کا لفظ خاص اس شکل کے لئے بھی آیا ہے جسے ہم نماز کہتے ہیں۔ جو وقتِ مقررہ پر ادا ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴/۱۰۳)

بیشک صلوٰۃ مومنین کے لئے ایک مؤقت فریضہ ہے۔

یعنی ایسا فریضہ جس کی وقتِ معین پر ادائیگی کی جائے گی۔ صلوٰۃ کے اجتماعات کے متعلق قرآن میں مختلف مقامات پر تشریح کی گئی ہے۔ حوالے کے لئے دیکھئے ۲/۲۳ - ۴/۴۳ - ۴/۱۰۱ - ۲۴/۵۸ - ۴/۱۰۲ - ۵/۵۸ - ۱۱/۱۱۴ - ۶۲/۹-۱۰۔ اس سلسلے میں یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے خدا کی عبادت کا مفہوم زندگی کے ہر سانس اور کاروبارِ حیات کے ہر شعبے میں اس کی محکومیت اختیار کرنا یعنی اس کے قوانین و احکام کی اطاعت کرنا ہوتا ہے۔ صلوٰۃ (نماز) کی ادائیگی میں جسم کی ظاہری حرکات قیام، رکوع، سجود وغیرہ سب اطاعتِ الٰہی کے شعار SYMBOLS ہیں۔ یہ بندۂ مومن کے جذباتِ اطاعت و تسلیم کے اظہار کی (اجتماعات صلوٰۃ میں) ایک منضبط شکل ہے۔ اور اس اجتماعی عمل سے مقصود یہ ہے کہ فرد ملت کے ساتھ رہ کر ہر معاملۂ زندگی میں قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے۔ اس اجتماع میں الدِّین کے اصولی گوشے سمٹی ہوئی شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ ایک اُمت اس کے افراد۔ پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ، ایک صف میں ایستادہ، ایک امام (مرکزِ ملت) کی آواز پر پوری ہم آہنگی اور یک رنگی سے سب جھکتے اور اٹھتے ہیں اور نماز کا یہ پورا عمل اس حقیقت کا مظہر بنتا ہے کہ:۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ (۱/۴)

"ہم تیرے خدا کے سوا کسی کو صاحبِ اقتدار تسلیم نہیں کرتے۔ کسی اور کی عبودیت اختیار نہیں کرتے"

اس طرح دین کے نظام میں، اجتماعات صلوٰۃ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے دین کے قیام کی اساس ایک اُمت (حزب اللہ) کی تشکیل پر رکھی ہے، اس اُمت کی تشکیل و استحکام میں صلوٰۃ کے اجتماعات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے مقصد، ان کی غرض و غایت سے غفلت نہ برتی جائے۔ جیسا کہ سورہ ماعون میں بتایا گیا ہے کہ تکذیبِ دین کرنے والے وہ لوگ ہیں جو نماز کی محسوس اور ظاہری حرکات ہی کو الصلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور اس کے مقصد کو نظر انداز کئے رکھتے ہیں۔ سورہ النساء میں ایسے نمازیوں کو منافقین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ان کی حالت یہ بتائی گئی ہے کہ:-

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ (۴/۱۴۲)

"یعنی جب وہ الصلوٰۃ کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی کیفیت کسالی کی ہوتی ہے یعنی وہ انہی حرکات و سکنات کی ادائیگی سے سمجھ لیتے ہیں کہ صلوٰۃ کا فریضہ پورا ہو گیا۔ وہ حرکات و سکنات جنہیں لوگ دیکھ سکیں (اور ان کی تعریف کریں یہ کہتے ہوئے کہ یہ بڑے پکے نمازی ہیں)"

سوچنے کا مقام ہے کہ قرآن جن منافقین کی نشان دہی کر رہا ہے، کیا ہم ان میں شامل نہیں؟ ہم میں سے کتنے ایسے ہوں گے جو باقاعدہ نمازی ہوتے ہوئے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکیں کہ ان کی نمازیں منافقت سے قطعی پاک ہیں۔ اسی ضمن میں دوسری جگہ سورہ توبہ میں ارشاد ہوا ہے

وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (۹/۵۴)

"(منافقین کی کیفیت بتاتے ہوئے کہا گیا ہے) وہ صلوٰۃ کی طرف آتے ہیں تو کسالی کی کیفیت لئے ہیں اور اگر دین کی خاطر کچھ خرچ کرتے ہیں تو بیکار سمجھتے ہوئے"

یہ آیات بھی صلوٰۃ اور نظامِ انفاق کے باہم دگر ہونے کی شہادت دے رہی ہیں۔ اور اس سچائی کو سامنے لاتی ہیں کہ جس صلوٰۃ سے معاشی نظام کو الگ کر دیا جائے یا جس معاشی نظام کو نظامِ صلوٰۃ سے جدا کر دیا جائے وہ میزانِ خداوندی میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس کا انجام ابتری و پراگندگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں، خود ہمارا معاشرہ اس پر شاہد ہے۔ سورہ المومنون میں آیا ہے کہ صلوٰۃ کی ادائیگی دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ ہوتی ہے (۲۳/۲) یہاں سمجھنے والی بات یہ ہے کہ دل کے اس پورے جھکاؤ سے مُراد صرف نماز پڑھتے ہوئے ہی حرکات و سکنات میں خضوع و خشوع سے کام لینا نہیں بلکہ یہ جھکاؤ ہر معاملۂ زندگی اور تمام تر معاملاتِ روز و شب میں قوانین و احکامِ خداوندی کے سامنے جھکے رہنا ہے۔ اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ یہی وہ روشِ زندگی ہے جس سے نظامِ صلوٰۃ کی پوری پوری حفاظت ہو سکتی ہے۔ اسی کا دوسرا نام اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ سورہ النور کی

۴۱ ویں آیت میں خالقِ کائنات پرندوں کی مثال دے کر، اپنے بندوں کی دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ط (۲۴/۴۱)

"یعنی کائنات کی ہر شے اپنی اپنی صلوٰۃ (فریضۂ زندگی) کو بھی جانتی ہے اور اپنی اپنی تسبیح (سعی و عمل کے دائرے) کو بھی پہچانتی ہے"

اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر وقت سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ ہم تو انسان اور مسلمان ہونے کا شرف رکھتے ہیں، پھر ہماری صلوٰۃ اور تسبیح ہمیں بے عملی سے وابستہ کیوں رکھتی ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس بارے میں سوچا؟ صلوٰۃ کے اجتماعات کی موجودگی کے باوجود ہم نظامِ صلوٰۃ سے بے خبر اور اقامتِ صلوٰۃ سے غافل کیوں ہیں؟ اَلصَّلٰوۃ صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے، وہ صراط جس کے متعلق فرمایا۔

اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱/۵۶)

"بیشک (یہ یقینی بات ہے کہ) میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے"

یعنی اس کا قانونِ ربوبیت خود متوازن راہ پر چل رہا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے تم بھی چلتے جاؤ۔ سورہ اعراف کی ۱۲۰ ویں آیت میں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ "متقی وہ ہیں جو قانونِ خداوندی کے ساتھ پورا پورا تمسک رکھتے ہیں۔ یعنی اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں۔ یہی مُصلّین ہمواریاں پیدا کرنے والے ہیں جن کے اعمال ضرور نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔

ہماری نمازیں کیوں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتیں۔ ہمارا معاشرہ ہر قسم کے بگاڑ کا شکار کیوں ہے؟ نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ انتشار و بگاڑ سے بھی دامن ملوث رہتا ہے۔ بدعنوانیاں اور ناہمواریاں ہمارے معاشرے کی پہچان بن چکی ہیں۔ پھر بھی ہم یہ کہنے سے ذرا نہیں ہچکچاتے کہ "اللہ کے فضل" سے ہماری مسجدیں آباد ہیں۔ ہماری اکثریت نماز پڑھنے سے غافل نہیں ہے۔ یہ وہ خود ساختہ و غیر حقیقی اطمینان ہے۔ جو ہماری نماز پڑھنے کو اقامتِ صلوٰۃ کی اساس نہیں بننے دیتا۔ چنانچہ ہماری نمازی اپنی جگہ اور معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے فواحش و منکرات اپنی جگہ۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵)

"یعنی الصَّلٰوۃ یقیناً فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے"

یہی الصَّلٰوۃ کے صحیح اور قرآنی ہونے کا معیار ہے۔ عربی زبان کی رُو سے فحشاء میں ہر قابلِ نفرت امر شامل ہے۔ اس کے معنی بُخل کے بھی ہیں کیونکہ عربوں کے ہاں بخل انتہائی درجہ کی قابلِ نفرت خصلت تھی سورہ بقرہ میں ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ... (۲/۲۶۸)

"یعنی تمہارے مفاد پرستانہ جذبات (شیطان) تمہارے دل میں تنگ دستی کا خوف پیدا کر کے تمہیں بخل کی تعلیم دیتے ہیں۔"

منکر بھی ہر معیوب بات کو کہتے ہیں لیکن بنیادی طور پر اس کے معنی عقل خود بین کی حیلہ جوئیاں اور فریب کاریاں ہیں۔ وحی سے بے تعلق یہ عقل، انسان کو اس کے ہر فعل اور فیصلے کے لئے جواز ڈھونڈ دیتی ہے چنانچہ آیۃ مذکورہ کا یہ قرآنی مفہوم ہمارے سامنے آتا ہے کہ الصلوٰۃ انسان کے دل سے بخل کے جذبات نکال دیتی ہے اور عقلِ خود بین کو اس کے جواز کی راہیں سمجھانے کے راستے میں روک بن جاتی ہے۔ یہی اقامتِ صلوٰۃ کا راستہ ہے۔ جب تک ہم جزوِ صلوٰۃ یعنی اپنی نمازوں کو اس نصب العین قرآنی کے تحت ادا نہ کریں گے، ہم فواحش و منکرات سے چھٹکارا نہیں پا سکیں گے۔ بندۂ مومن کا مقصدِ زندگی صرف اور صرف یہ ہوتا ہے۔

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۱۶۳)

"میری صلوٰۃ اور تمام دیگر مخلص اعمال، میرا جینا میرا مرنا، سب اللہ کی رب العالمینی کے عام کرنے کے لئے ہیں۔"

ہمیں بھی مومن ہونے کا دعویٰ ہے۔ آیئے اپنے اعمال پر نظر ڈالیں!

بقیہ از استفسارات صفحہ ۵۲

آپ کے رفقائے کار رضی اللہ عنہم کے پھیلائے ہوئے عربی اسلام کے فراموش کردہ نقوش صرف ادارہ طلوعِ اسلام ہی کی طرف سے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ادارہ کی انہی حسن کارانہ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کرنے کے طلب گار، قلوبِ سلیم کی طرف سے آج ادارہ میں کثیر تعداد میں خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ جن میں قرآنی نقطۂ نظر سے وضاحت مطلوب ہوتی ہے۔

ادارہ نے ملک کی موجودہ صورتِ حال اور اس ضرورت کے پیشِ نظر خصوصی انتظامات کیے ہیں۔ اور وضاحت طلب امور سے متعلق قرآنی تعلیمات کو پیش کرنے کے لیئے ناظم ادارہ کی سرکردگی میں ایک شعبہ قائم کیا ہے جس سے عند الضرورت رجوع کیا جا سکتا ہے۔ خواہشمند حضرات بذریعہ مراسلت اس سے حسبِ ضرورت استفادہ کر سکتے ہیں۔

استفسارات کے ضمن میں ادارہ کی طرف سے صرف اتنی گذارش ہے کہ **سوالات زندگی کے عملی مسائل سے متعلق ہونے چاہئیں۔**

محترم محمد اسلام صاحب
کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شریعت آرڈیننس

اس سے قبل کہ "شریعت آرڈی ننس" کے متعلق کچھ تحریر کیا جائے، اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ہمارا تعلق کسی فرقہ سے نہیں ہے اس لیئے ہمارے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم فلاں فقہ کے حق میں ہیں اور فلاں کے خلاف، نہ ہی ہم ملک کی عملی سیاست میں حصّہ لیتے ہیں، جو یہ سمجھا جائے کہ ہم سیاسی نقطۂ نگاہ سے حکومت کے خلاف تنقید کرتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور قرآن کریم کو دین میں سند اور حجت تسلیم کرتے ہیں۔ اسی قرآن کی رُو سے ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جہاں کوئی ایسی بات اسلام کی طرف منسوب کی جا رہی ہو جو قرآن کے خلاف ہو تو ہم اس کی نشاندہی کریں اور مخالفت بھی۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیئے ہم اپنے آپ کو خدا کے حضور جواب دہ سمجھتے ہیں۔ بارگاہِ خداوندی میں اسی جوابدہی کا احساس ہے جس کی رُو سے ہم اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ یہاں جو کچھ اسلام کے نام پر ہو رہا ہے اس کا جائزہ لے کر یہ بتائیں کہ اس میں فلاں بات قرآن کے خلاف ہے۔ اگر حکومت اپنے قوانین کو، محض قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کرے تو ہمارے جائزہ کا انداز اور ہوگا لیکن اگر انہیں اسلامی قوانین کہہ کر نافذ کیا جائے تو ہم پر لازم آجاتا ہے کہ قرآن کریم کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جائے۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ (۲/۱۵۹)

"جو لوگ ان واضح احکام اور راہ نمائی کی باتوں کو چھپا کر رکھیں جنہیں ہم نے نازل کیا ہے اس کے بعد کہ ہم نے انہیں تمام لوگوں کے لیے اپنی کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا کی بھی لعنت ہے اور ہر لعنت کرنیوالے کی بھی لعنت"

سورۃ البقرہ میں حکم دیا گیا ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (۲/۴۲)

"جب تم جانتے ہو کہ حق کیا ہے تو پھر نہ تو حق اور باطل کو ایک دوسرے کیساتھ

خلط ملط کرو اور نہ ہی حق کو چھپاؤ۔"

اس وضاحت کے بعد آئیے اب شریعت آرڈیننس کا جائزہ لیتے ہیں۔

شریعت آرڈیننس میں کہا گیا ہے کہ (۲ : ۴) "شریعت سے اسلام کے وہ احکام مُراد ہیں جو قرآنِ پاک اور سُنّت میں مرقوم ہے" ——— اس کی تشریح بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ :۔

"جیسا کہ دستور کے آرٹیکل 22 میں مرقوم ہے، کسی مسلم فرقہ کے کسی شخصی قانون کے ضمن میں شریعت کی تشریح اور تعبیر میں "قرآنِ پاک اور سنّت" کے الفاظ سے مُراد اس مسلم فرقہ کے مطابق قرآنِ پاک اور سنّت کی تشریح اور تعبیر ہوگی۔ ——— یعنی شریعت آرڈیننس کی شق نمبر ۴ کی ذیلی شق (۲) کی رُو سے کسی قانون کے اسلامی ہونے کے لیئے ضروری ہوگا کہ وہ

1۔ قرآن کے خلاف نہ ہو ۔ اور 2۔ سُنّت کے خلاف نہ ہو

اس آرڈیننس کی رُو سے خود صدرِ مملکت نے قرآنِ کریم کے واضح احکامات کے باوجود فرقہ بندی کو سند عطا فرما دی ہے۔ قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو بالفاظ صریح شرک قرار دیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲)

"مسلمانو! دیکھنا، تم ایمان لانے کے بعد مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی اُن لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیئے، اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ پھر کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ مطمئن ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں اور باقی باطل پر"

نبیؐ آخر الزّمان سے برملا کہہ دیا گیا کہ :۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

"اے رسولؐ! جو لوگ اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیں اور خود بھی ایک فرقہ سے متمسّک ہو جائیں۔ تیرا اُن سے کوئی واسطہ نہیں"

قرآنِ کریم کے اِن واضح احکامات کی رُو سے صدرِ مملکت کے آرڈیننس کا جس میں انہوں نے فرقہ بندی کو تسلیم کرتے ہوئے اسے سند بھی عطا فرما دی قرآنِ کریم کی میزان میں جو وزن رہ جاتا ہے، وہ

اظہر من الشمس ہے۔

قرآن کریم روئے زمین کے کسی "اسلامی سربراہ" یا اس کی کسی اعلیٰ ترین عدالت کو بھی اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کوئی ایسا فرمان، فیصلہ یا حکم جاری کر سکیں۔ جو قرآن کے احکامات کے خلاف ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی سربراہ یا اعلیٰ ترین عدالت کوئی ایسا فرمان، فیصلہ یا حکم جاری کرتا ہے جو کتاب اللہ کے خلاف ہو تو ایسے فرمان، فیصلہ یا حکم کی پابندی یا اطاعت کسی مسلمان کے لیے کس طرح جائز قرار پا سکتی ہے۔؟

اس فرمان، فیصلہ یا حکم کے متعلق تو اللہ کا فرمان یہ ہے کہ:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (۵/۴۷)

"اور جو لوگ "ما انزل اللہ" کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔"

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (۵/۴۵)

"اور جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ ظالم ہیں"۔

اور سب سے آخری بات یہ کہ:۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (۵/۴۴)

"اور جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔"

صدرِ مملکت نے مذکورہ بالا شریعت آرڈیننس جاری کر کے نہ صرف یہ کہ ارشادِ خداوندی کے علی الرغم "مسلّمہ فرقوں" کو سند بہم پہنچا دی ہے بلکہ باقی ماندہ ایسے مسلمانوں کو جن کا تعلق کسی "مسلّمہ فرقہ" سے نہیں ہے۔ یا جو کتاب اللہ ہی کو واحد ضابطۂ حیات تسلیم کرتے ہیں مجبور بنانے کی سعی کی ہے کہ بالضرور وہ کسی نہ کسی مسلّمہ فرقہ سے اپنی وابستگی ظاہر کریں بصورتِ دیگر انہیں کسی نہ کسی مسلّمہ فرقہ کی فقہ کے مطابق فیصلہ شدہ قانون کے تابع زندگی بسر کرنا ہو گی۔ خواہ وہ اسے شرک ہی کیوں نہ سمجھتے ہوں۔

فرقہ بندی

جہاں تک فرقہ بندی ــــ پبلک لاز اور پرسنل لاز کا تعلق ہے، ایک شرک ہے تو دوسری بدعت ــ اسلامی حکومت، حضورؐ کے عہدِ ہمایوں میں قائم ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تک باقی رہی۔ اس حکومت میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی تھی۔ کتاب اللہ کے احکام و قوانین و اقدار کو نافذ کرنے کے لیے جو طور طریقے اختیار کیے گئے تھے انہیں نہ غیر متبدّل قرار دیا گیا تھا نہ انہیں علیٰ حالہٖ قائم رکھا گیا، یہ وجہ تھی کہ اس دور میں کتاب اللہ کی حفاظت کا تو

اس قدر اہتمام کیا گیا لیکن ان جزئی قوانین کو نہ کہیں مرتّب و مدوّن کیا گیا نہ انکی حفاظت کا کوئی انتظام کیا گیا۔ انہیں زمانے کے تقاضوں کے تحت بدلتے رہنا تھا۔ اس لیئے انہیں منضبط کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ احادیثِ رسولؐ اللہ یا عہدِ خلافتِ راشدہ میں جاری کردہ احکام کا کوئی مجموعہ اس زمانے میں ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا تو اس کی وجہ ہی یہ تھی۔ جس چیز کو غیر متبدّل رہنا تھا۔ (یعنی کتاب اللہ) اس کی نشر و اشاعت اور نظم و ضبط کا انہوں نے ایسا اہتمام کیا کہ (امام ابن حزمؒ کے قول کے مطابق) عہدِ فاروقیؓ میں مملکت میں قرآن کریم کے قریب ایک لاکھ نسخے پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن اس دور کے بدلتے رہنے والے احکام کا ایک پرزہ بھی کہیں نہیں ملتا۔

اس کے بعد بنی اُمیّہ کا دور آیا۔ اس دورِ حکومت کا جو بھیانک نقشہ تاریخ میں کھینچا گیا ہے ہم سرِدست اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہم صرف اس کی ایک خصوصیّت کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ انہوں نے بھی اپنے احکام حکومت کا کوئی ضابطہ مرتّب نہیں کیا۔ آپ اس دور میں نہ کسی خاص فقہی مذہب کا نشان دیکھیں گے نہ فقہی قوانین کے کسی مجموعہ کا تذکرہ۔ انہوں نے بھی قرآن ہی کی حفاظت کی اور اسی کو آگے بڑھایا یہ وجہ ہے جو اس دور میں نہ اُمّت میں فرقے پیدا ہوئے نہ فرقہ وارانہ فقہیں وجود میں آئیں۔

اس کے بعد عبّاسی دور ہمارے سامنے آتا ہے جو سابقہ ادوار سے ہٹا ہوا ہے۔ ان کی حکومت بھی اسلامی نہیں تھی۔ کیونکہ ملوکیّت اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں، جو یک جا ہو ہی نہیں سکتے۔ لیکن اس دور میں مختلف فقہیں مرتّب ہوئیں۔ ان کی وجہ سے اُمّت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ توحید نام تھا ایک کتاب اللہ کی حکمرانی کا، جب اس کی حکمرانی نہ رہی تو اُمّت میں توحید بھی باقی نہ رہی۔ توحید تو ایک طرف، اُمّت کی وحدت بھی باقی نہ رہی۔ وہ حنفی، شافعی، مالکی وغیرہ گروہوں میں بٹ گئی یہی وہ فرقہ بندی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے شرک قرار دیا تھا۔ جوں جوں یہ دور آگے بڑھتا گیا اُمّت کا انتشار، خلفشار، افتراق و اختلاف بھی زیادہ ہوتا چلا گیا۔ اب اُمّت کا کوئی فرد صرف مسلم کے نام سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اسے بتانا پڑتا تھا کہ وہ کون سا مسلمان ہے — شیعہ، سُنّی، اہلحدیث، اہل فقہ، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی (اور نہ جانے کتنی اور اضافتیں) عبّاسی دور ختم ہو گیا لیکن اس دور میں پیدا شدہ مختلف فقہیں اور انکی نسبت سے مختلف فرقے آگے چلتے گئے۔ اب انہی فقہوں کا نام اسلام ہے اور انکے پیروؤں کا نام مسلمان یہ فقہی

احکام چونکہ زمانے کے بڑھتے ہوئے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے اس لیئے فطرت کے اٹل قانون کے مطابق یہ آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے تھے۔ انکی جگہ مسلمان مملکتوں نے اپنے یہاں سیکولر نظام رائج کر لیا۔ مدت سے مسلمانوں کے نظام اجتماعی کی یہی صورت رہی یعنی نظام حکومت یا ملوکیت یا سیکولر ہے اور ان میں شخصی قوانین کی حد تک کسی نہ کسی فقہ کے احکام کار فرما۔ قرآن کا مصرف یہ رہ گیا۔ کہ از یٰسین او آساں بمیری۔

اس صورتِ احوال کی شدت احساس کا نتیجہ تھا کہ علامہ اقبالؒ نے ایک ایسی جدید مملکت کا تصور دیا جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہو اور اس طرح اسلام اپنی حقیقی شکل میں پھر سے دنیا کے سامنے آسکے۔ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظم محمد علی جناحؒ دونوں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ اس مملکت میں قرآنی قوانین نافذ ہونگے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ جب یہاں قانون سازی کا وقت آیا تو نہ علامہ اقبالؒ موجود تھے نہ قائد اعظمؒ۔

پبلک لاز

شریعت آرڈیننس میں پبلک لاز بنانے کے لیئے یہ امر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوں۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس اصول کے تابع کوئی ایسا قانون بنانا ممکن ہوگا جو نہ تو قرآن کریم کے خلاف ہو اور نہ ہی سنت کے۔ قرآن کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایک متعین و معروف کتاب ہے جس کا ایک ایک نقطہ تمام مسلمانوں کے لیے مسلّم ہے۔ اس کی کسی صورت یا آیت کے متعلق تو ایک طرف اس کے کسی ایک لفظ کے متعلق بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ قرآن میں ہے یا نہیں۔ یہ کتاب ایسی متفق علیہ اور مسلّم ہے ۔۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس شرط کے دوسرے جزو ۔۔ سُنّت ۔۔ کی بھی یہی پوزیشن ہے یہ وہ بنیادی سوال ہے جس پر اس سارے مسئلہ کی عمارت استوار ہوتی ہے، اس لیئے یہ بڑی گہری توجہ کا محتاج ہے۔

حدیث اور سُنّت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم ایک متعین اور متعارف کتاب ہے لیکن دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے متعلق کہا جا سکے کہ وہ سنّت رسول اللہ کا مجموعہ ہے ۔۔۔ اہلحدیث حضرات کہتے ہیں کہ سنّت اور حدیث دو مترادف الفاظ ہیں۔ یعنی حدیث ہی کو سنّت کہا جاتا ہے۔ اس تعریف کی رُو سے "قرآن و سُنّت" کے معنی ہونگے ۔۔ قرآن اور حدیث ۔۔۔ لیکن دیگر حضرات اس سے متفق نہیں۔ جماعت اسلامی کے سابق امیر مودودی (مرحوم) اس باب میں اپنی کتاب "رسائل و مسائل" حصہ اوّل میں تحریر فرما گئے ہیں کہ :-

سُنّت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبیؐ نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے ایک خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کیے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں۔ اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جز سُنّت ہے اور کونسا جز عادت، بغیر اسکے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔" صـ ۳۱۱

اسی کتاب میں دوسری جگہ رقم ہے :-

"بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپؐ کے عہد کے تمدّن سے تعلّق رکھتی ہیں۔ ان کو سُنّت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اسکی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبیؐ پہنتے تھے اور شرائع الٰہیہ اس غرض کے لیے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق، یا کسی قوم کے مخصوص تمدّن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سنّت بنا دیں۔ سنّت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سُنّت نہیں ہیں اُن کو خواہ مخواہ سنّت قرار دے لینا منجملہ اُن بدعات کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔" ایضاً صـ ۳۱۴

یعنی اہلحدیث حضرات کے نزدیک، ہر وہ بات جو احادیث کے صحیح مجموعوں میں درج ہے، سنّت ہے لیکن مودودی (مرحوم) کے نزدیک، ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ سنّت صرف اس طریقِ عمل کو کہیں گے جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا ـــــ اس سے وہ تمام باتیں خارج ہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنّت قرار دے تو اس کے متعلّق مودودی مرحوم کا ارشاد ہے کہ:-

"میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنّت قرار دینا اور پھر ان کے اتّباع پر

اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔" ایضاً صہ ۳۰۸

مودودی (مرحوم) کی پیش کردہ سنّت کی اس تعریف کے متعلق 'مولانا محمد اسمٰعیل صاحب صدر جمعیّت اہلحدیث نے لکھا :۔

"میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلکِ اہلحدیث کے خلاف ہیں، بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہلحدیث کے خلاف ہیں، ان میں آج کے جدید اعتزال اور تجہّم کے جراثیم مخفی ہیں۔" (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث صہ ۱۱)

غور فرمایئے کہ خود سنّت کی تعریف کے سلسلہ میں ان حضرات میں باہمی اختلافات کس قدر گہرے ہیں۔

حدیث کے متعلّق اختلافات

احادیث لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ان میں سے چھ کتابیں ایسی ہیں جنہیں صحیح احادیث کے مجموعے سمجھا جاتا ہے، انہیں صحاح ستّہ کہا جاتا ہے۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی) ان میں سے بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے اور بخاری کو "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ سمجھا جائے گا کہ احادیث کے ان مجموعوں میں جس قدر احادیث درج ہیں وہ (شیعہ حضرات کو چھوڑ کر باقی) مسلمانوں کے نزدیک صحیح احادیث ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ اہلحدیث کا اس باب میں مسلک یہ ہے کہ :۔

"بخاری اور مسلم کی صحت پر اُمّت متّفق ہے ..... ان احادیث کی صحت قطعی ہے"
(جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث صہ ۴۸)

قطعی صحت کے معنی یہ ہیں کہ :۔

"تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا ..... جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سُنّت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملّت سے خروج کے مترادف" ایضاً صہ ۵۵

یعنی ان حضرات کے نزدیک بخاری یا مسلم کی کسی ایک حدیث سے انکار کفر ہے اور دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف۔ اس کے برعکس مودودی (مرحوم) کا یہ مسلک ہے کہ :۔

"یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں انکے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے" (ترجمان القرآن اکتوبر نومبر ۱۹۵۲ء)

جماعتِ اہلحدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ :-

"جبریل، قرآن اور سُنّت دونوں کو لیکر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنّت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں"۔

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث صـ۶)

اس کے برعکس مودودی (مرحوم) کا مسلک یہ ہے کہ :-

"قولِ رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو اسناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآن کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے بھی یا نہیں"

(رسائل و مسائل جلد اوّل صـ۷۰)

حدیث کی تاریخ

جو حضرات علم حدیث اور اس کی تاریخ سے واقف نہیں، ان کی اطلاع کے لیئے یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتّب کر کے اُمّت کو نہیں دیا تھا۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ یا دیگر صحابہ کبارؓ نے کوئی ایسا مجموعہ مرتّب کیا۔ جسے احادیث کا صحیح ترین مجموعہ (یعنی بخاری شریف) کہا جاتا ہے، وہ رسول اللہؐ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد انفرادی طور پر مرتّب ہوا۔ وہ بھی کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کی رُو سے نہیں، بلکہ اس طرح کہ امام بخاریؒ سے ایک شخص نے آکر رسولؐ اللہ کی کوئی بات بیان کی۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں اس کا علم کیسے ہوا، اس نے کہا کہ فلاں شخص سے سُنا تھا، جو اب فوت ہو چکا ہے۔ اس نے فلاں سے، اس نے فلاں سے۔ اور اس طرح آخری راوی نے رسولؐ اللہ سے سُنا تھا۔ اُن راویوں کو اس حدیث کی سند کہا جاتا ہے اور اس سلسلہ کو سلسلۂ اسناد۔ جس حدیث کو صحیح کہا جاتا ہے، اس کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اس کے بیان کرنے والے راویوں کے متعلق، بعد میں (یعنی انکی وفات کے سینکڑوں برس بعد) یہ تحقیق کر لیا گیا تھا کہ وہ بڑے قابلِ اعتماد لوگ تھے لہٰذا جس بات کو رسولؐ اللہ کی حدیث کہا جاتا ہے وہ

دراصل، "قول منسوب الی الرّسول" ہوتی ہے یعنی ایسی بات جسے رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں مودودی (مرحوم) نے لکھا تھا:۔

"اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اسکی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی حجت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے" (رسائل و مسائل ص۔ ۲۵)

ان تصریحات کی روشنی میں غور فرمائیے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن بھی ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا متفق علیہ مجموعۂ قوانین (خواہ وہ پبلک لاز ہی کیوں نہ ہوں) مرتب کیا جا سکتا ہے جو کتاب و سنّت سے مطابقت کی شرط کو پورا کر سکے۔ اس سلسلہ میں ایک ہی مثال پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے ملاحظہ فرمائیے:۔

قانونِ وصیّت

قرآن کریم میں وصیّت کے متعلق کہا گیا ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ (۲/۱۸۰)

"جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ کھڑی ہو اور وہ کچھ مال چھوڑے تو اس پر فرض ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ اپنے ماں باپ اور رشتے داروں کے لیے وصیّت کرے، ایسا کرنا متّقیوں پر لازم ہے۔"

اس سے واضح ہے کہ خدا کی طرف سے ہر مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے ترکہ سے اپنے ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کے لیے وصیّت کر کے مرے۔ اتنا ہی نہیں، دوسری جگہ وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ یہ وصیّت کس طرح لکھی جائے، کون لکھے، گواہ کون ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ دیکھیے (۵/۱۰۶) پھر سورۃ نساء میں جہاں تقسیم وراثت سے متعلق احکام آئے ہیں وہاں مختلف حصّے بیان کرنے کے بعد کہا ہے۔ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ (۴/۱۱) یہ حصّے اس وصیّت کو پورا کرنے کے بعد دیئے جائیں جو متوفّی نے کی ہو۔ نیز اس کا قرضہ ادا کرنے کے بعد۔ اور یہ الفاظ ایک مرتبہ نہیں، تین مرتبہ دہرائے گئے ہیں کہ ترکہ کی تقسیم اس مال سے ہو گی جو وصیّت

پوری کرنے اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد بچے گی، یہ ہے قرآن کریم کا واضح حکم۔

اس کے برعکس حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ وصیّت صرف تہائی مال میں کی جا سکتی ہے۔ اور وہ بھی وارثین کے لیے نہیں۔

یعنی قرآن کریم پورے مال میں وصیّت کا حکم دیتا ہے اور اس میں وارث بھی شامل ہیں اور حدیث اس کے برعکس ایک تہائی مال میں وصیّت کی اجازت دیتی ہے اور وہ بھی وارثوں کے لیے نہیں۔

ہم ایک طرف شریعت آرڈیننس مرتّب کرنے والوں اور اسے نافذ کرنے والے صدرِ مملکت سے اور دوسری طرف ان علماء کرام کو جو اس حکم کو سُنّت رسول اللہؐ قرار دینے پر مصر ہیں ——— **چیلنج** دیتے ہیں کہ وہ وصیّت کے متعلق ایسا قانون مرتّب کر کے دکھائیں جو قرآن و سنّت کے خلاف نہ ہو۔ آپ کوئی سا قانون بنائیے وہ یا تو کتاب اللہ کے خلاف ہوگا، یا اس سنّت رسول اللہؐ کے خلاف۔ آپ قیامت تک ایسا قانون نہیں بنا سکتے جو ان دونوں شرطوں کو پورا بھی کر سکے اور تمام مسلمانوں کے لیے متّفق علیہ بھی ہو۔

کتاب اللہ سے استثناء

شریعت آرڈیننس کی شق ۱۳ میں کہا گیا ہے۔

"بین الاقوامی مالی ذمّہ داریوں کا تسلسل ——— اس آرڈیننس کے احکام یا اس کے تحت کسی فیصلے کے باوجود اس آرڈیننس کے نفاذ سے پہلے یا بعد کسی قومی ادارے اور بیرونی ایجنسی کے درمیان عائد کردہ یا کی جانے والی ذمّہ داریاں اور کیے گئے اور کیے جانے والے معاہدے مؤثر، لازم اور قابلِ عمل رہیں گے۔ اور کوئی عدالت بشمول عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ اس کی مجاز نہیں ہوگی کہ ایسی ذمّہ داریوں اور معاہدوں کے متعلق اس آرڈیننس کے تحت کوئی حکم دے یا فیصلہ جاری کرے۔"

آئیے دیکھیں کہ میزان خداوندی میں شریعت آرڈیننس کی اس شق کا کیا وزن ہے :۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ... (۲:۲۰۸)

"اے جماعتِ مومنین! تم اس امن و سلامتی کے نظام معاشرہ کے پورے داخل ہو جاؤ"

اس کے برعکس روشِ زندگی اختیار کرنے والوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا گیا ہے:۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّونَ إِلٰى أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ ..... ○ (۲/۸۵)

"کیا تم الکتاب کے بعض حصّے پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصّے سے انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ وہ دُنیاوی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو اور آخرت میں شدید ترین عذاب کا مستحق"

مملکتیں وجود میں آتی ہیں، مملکتیں فنا ہو جاتی ہیں سلطنتیں قائم ہوتی ہیں، سلطنتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ حکومتیں بنتی ہیں، حکومتیں ٹوٹتی ہیں۔ یہ تاریخ کی گردشِ دولابی ہے جو شروع سے آج تک جاری و ساری ہے۔ حکومتوں کے نفع بخش کارناموں کی یاد، ان کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی لوگوں کے ذہن میں رہتی اور زبانوں پر آتی ہیں۔ ان کے مظالم کا رونا خود انکی موجودگی میں بھی رویا جاتا ہے۔ اور ان کے بعد بھی ان کے مرتّب اور نافذ کردہ قوانین بھی اپنی مدّت العمر ختم کرنے کے بعد صفحۂ تاریخ سے مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے قوانین لے لیتے ہیں۔ اس تبدیلی میں کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگتا کیونکہ زمانے کے تقاضے جلدی جلدی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن کوئی حکومت جو لکیریں مذہب کے نام پر کھینچ دیتی ہے انکی عمر بڑی دراز ہوتی ہے اور (اگر وہ غلط تھیں تو) ان کی تباہ کاریوں کا سلسلہ بھی مدّتِ مدید تک جاری رہتا ہے۔ یہ اس لیئے کہ مذہب کا تعلّق انسان کے لطیف ترین جذبات سے ہوتا ہے اور ان کے پیدا کردہ نقوش مٹتے مٹتے بھی صدیاں لے لیتے ہیں۔

ہم صدرِ مملکت کی خدمت میں یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہماری ان گذارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم بارگاہِ خداوندی میں بری الذّمہ ہو سکیں کہ أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّي ○ (۷/۶۲) ہم نے پیغاماتِ خداوندی آپ تک پہنچا دیے تھے اور آپ بارگاہِ خداوندی میں یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِينَ ۝ (۷/۱۷۲) ہمیں ان باتوں کا علم نہیں تھا، ہمیں کسی نے بتایا ہی نہیں تھا۔ فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ ۚ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللّٰهِ ۚ۔ اگر آپ آج اسے درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے تو ایک وقت آئے گا جب آپ ان باتوں کو یاد کریں گے۔ باقی رہے ہم۔ سو اس ذمّہ داری سے سبکدوش ہونے کے بعد ہم اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ إِنَّ اللّٰهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ○ (۴۰/۴۴)

خالد منصور نسیم

شخصیّت پرستی کی لعنت!

تاریخِ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ قوموں کی کشتی شخصیت پرستی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ خواہ یہ شخصیت پرستی دنیاوی حکمرانوں کو ظلّ اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دینے کی شکل میں ہو، اور خواہ "روحانی پیشواؤں" کو فوق البشر حیثیت دینے کی صورت میں۔ شخصیّت پرستی کی دوسری شکل، پہلی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید، محکم اور عمیق ہوتی ہے۔ حکمرانوں کی محکومیّت کی زنجیریں، انسان کے جسم کو مقیّد کر سکتی ہیں لیکن "روحانی پیشوائیت" کی محکومیت کا تصوّر انسان کے قلب و دماغ پر ہوتا ہے۔ اگر کسی "حضرت صاحب" کی شان کے خلاف کوئی خیال تک ان کے کسی عقیدت مند کے دل میں گذر جائے تو وہ ڈرتا ہے۔ کانپتا ہے، لرزتا ہے۔ کہ نہ معلوم اس سے مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اسلئے وہ اُن کے حضور دست بستہ حاضر ہو کر روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، معافیاں مانگتا ہے، پاؤں پکڑتا ہے کہ یا حضرت! مجھے بخش دیجئے ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ سوچئے کہ شرفِ انسانیت کی تذلیل کی اس سے بڑھ کر کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے؟ لیکن شخصیّت پرستی یہ سب کچھ کراتی ہے۔

قرآنِ کریم جو عظیم انقلاب دلوں کی بستیوں میں لایا، اس کی رُو سے شخصیّت پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اس نے سب سے پہلے یہ کہہ کر کہ حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں، انسانی حکمرانی کے تصوّر تک کو مٹا دیا۔ پھر یہ کہہ کر کہ خدا کی یہ حکومت، اس کی کتاب کی اطاعت کے ذریعے رُوبہ عمل آئے گی، یہ اعلان کر دیا کہ اطاعت، قانون کی ہو گی، کسی انسان کی نہیں ہو گی۔ سورہ آل عمران کی آیۃ ۷۸ میں دیکھئے کہ اس منشورِ خداوندی نے کس طرح ہر قسم کی شخصیّت پرستی کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ:-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (آل عمران آیہ ۷۸)

"کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطۂ قوانین، حکومت کے اختیارات اور نبوّت تک بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔

اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی اطاعت سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور اس کی حکمت پر غور و خوض کرتے ہو۔ ربانی بن جاؤ۔ (اقتباس از شاہکارِ رسالت ص ۷۶، ۷۷)

خُدا کے بعد، مدارج کے لحاظ سے انسانوں کی دنیا میں بلند ترین اور سب سے بڑھ کر عظمت و احترام کی سزاوار شخصیت حضور خاتم المرسلینؐ نبیٔ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں جن کے متعلّق ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۝ (النجم آیہ ۷)

اور آپ (علم کے) بلند ترین مقام پر فائز ہیں (جہاں عقلِ انسانی کی رسائی ممکن نہیں ۸۱/۳۲)

آپؐ ہی کی ذاتِ گرامی کے متعلّق ربِ جلیل نے فرمایا۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ (الم نشرح آیہ ۴)

اور (اے رسول!) ہم نے آپ کے نام کو بلند کیا۔

اور آپؐ ہی کے لئے سب سے سچّا گواہ یہ گواہی دیتا ہے۔

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝ (القلم آیہ ۴)

اور (اے رسول!) بے شک آپ (اخلاقِ حسنہ) کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔

اللہ جلّ شانہٗ کے بیان فرمودہ انہی اوصافِ جمیلہ کے پیشِ نظر کہا گیا کہ:۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

چونکہ قرآنِ کریم شخصیت پرستی کو جڑ سے کاٹ پھینکتا ہے، لہٰذا اس قرآنِ کریم کو لانے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ ان عظمتوں کے مالک ہونے کے باوجود آپ نے یہ اعلان فرمایا کہ:

أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ ..... ۝ (حٰم السجدۃ آیہ ۶)

"میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں اس فرق کے ساتھ کہ مجھے خدا سے وحی ملتی ہے۔ جب میں اس وحی کو تم تک پہنچا دیتا ہوں تو پھر انسان ہونے کی حیثیت میں مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں رہتا۔"

اور قادرِ مطلق کا یہ فرمان کہ:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ..... ۝ (آل عمران آیہ ۱۴۴)

"اور محمدؐ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔"

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے فرستادہ ہیں، اللہ کی طرح معبود نہیں۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ آپ کے دست پروردگانؓ نے آپ سے کس قسم کی تعلیم حاصل کی تھی؟

شخصیت پرستی کی یا شخصیت پرستی کی لعنت کو اس دنیا سے مٹانے کی؟

تاریخ اُمت مُسلمہ میں، سب سے پہلا موقع حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ ارضی کے اختتام پر پیش آیا۔

"شمعِ نبوتؐ کے پروانوں کے لئے محبوبؐ دلنواز کی یہ جدائی قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھی۔ ان کے دل کی بستیوں میں حشر برپا ہو گیا۔ دردِ فراق سے سینے شق ہو رہے تھے۔ دل کا خون آنکھوں میں کھچا آ رہا تھا۔ دنیا اُن کی آنکھوں میں اندھیر ہو رہی تھی۔ بزمِ کائنات انہیں بے کیف نظر آ رہی تھی اور بہارِ زندگی افسردہ و پژمردہ۔ لیکن غم و الم کے اس ہوش رُبا عالم میں ایک ایسا پیکرِ ضبط و سکون تھا جسے تربیتِ نبویؐ نے جبر میں اختیار اور بے قراری میں قرار کا سلیقہ سکھایا تھا۔ وہ جسے غار کی یاس انگیز تنہائیوں میں لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴿التوبہ آیہ ۴۰﴾ کی تعلیم ایمان افروز و استقامت بخش سے نا اُمیدیوں کے ہجوم میں اُمیدوں کا روشن مستقبل دیکھنے کا انداز بتایا تھا۔ وہ پیکرِ ضبط و استقامت، وہ یارِ غارِ نبویؐ، وہ جس کے کندھوں پر جانشینیٔ رسولؐ کا بارِ عظیم آنے والا تھا، غم و اندوہ کے اس تلاطم میں، روشنی کے بلند مینار کی طرح اُٹھا اور دو جملوں میں مجمع کے سامنے اس حقیقتِ کُبریٰ کو بے نقاب کر گیا کہ اسلام کا نظامِ حق و صداقت اپنی داخلی قوتوں کے زور پر آگے چلنے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ شخصیتوں کا وابستہ دامن نہیں ہے کہ کسی ایک کی وفات سے سارے نظام کا خاتمہ ہو جائے۔ آپ (حضرت ابوبکر صدیقؓ) ممبر پر تشریف لائے اور مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

یا ایہا الناس! من کان یعبد محمداً فانہ قد مات ومن کان یعبد اللہ فانہ حی لا یموت۔

"لوگو! جو شخص محمدؐ کو اپنا معبود سمجھتا تھا وہ جان لے کہ اس کا معبود یقیناً مر گیا۔ لیکن جو اللہ کی عبودیت اختیار کئے ہوئے ہے اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے اُسے کبھی موت نہیں۔"

اور اس کی سند میں فرمایا کہ:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ .... ﴿آل عمران آیہ ۱۴۴﴾"

(اقتباس معراجِ انسانیت از محترم پرویز صاحبؒ ۳۹۹-۳۹۸)

اور اس طرح ممکنہ شخصیت پرستی کے جذبات کو ان کی ابتدا ہی میں فنا کر کے رکھ دیا۔

اس کے بعد خلیفۂ دوم، حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے کا واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صُلحِ حدیبیہ کے وقت کہ جسے قرآنِ کریم نے فتحِ مبین کہا ہے، نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے، ایک درخت کے نیچے، صحابہؓ سے بیعت لی تھی۔ حضرت عمرؓ کے خلافت کے زمانہ میں آپ نے دیکھا کہ لوگ آتے ہیں اور اس درخت کے نیچے نماز ادا کرتے ہیں۔

"عمومی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ معمولی بات تھی۔ لوگ نہ اس درخت کی پرستش کرتے تھے، نہ اس سے مُرادیں مانگتے تھے، صرف اس کے نیچے جا کر نماز پڑھتے تھے لیکن عمرؓ کی نگہِ حقیقت شناس اور دُور رس نے اس بظاہر معصوم سے عمل کے نیچے مہیب خدشات دیکھ لئے۔ حضرت عمرؓ کی نگاہیں اس درخت پر تھیں اور آنکھوں کے سامنے وہ حسین وجمیل منظر، سینما کے فلم کی طرح وجۂ فروغ دیدہ ہو رہا تھا جب اسلام پر سخت نازک وقت آیا تھا اور نظر آتا تھا کہ مخالفینِ مکّہ سے اب فیصلہ کُن تصادم ہوگا۔ حضورؐ کی دعوت پر صحابہ کبارؓ پروانہ وار آرہے تھے اور اس تصادم میں اپنی جانیں قربان کردینے کے عہد کی تجدید کر رہے تھے۔ حضورؐ توثیقِ عہد کے لئے، اپنا دستِ مبارک، صحابہؓ کے ہاتھ پر رکھتے تھے اور اُدھر سے یہ ندائے جمال باعثِ فردوسِ گوش ہو رہی تھی کہ تمہارے ہاتھوں پر بظاہر رسولؐ کا ہاتھ ہے لیکن اسے تم، خدا کا ہاتھ سمجھو کہ تمہارا یہ عہد خدا ہی کے ساتھ ہو رہا ہے جو تمہیں اس جاں فروشی کے عوض جنت کی بشارتؐ دیتا ہے۔"

کیسا فردوس بداماں تھا یہ منظر اور کس قدر جنّت بآغوش تھی اس کی یاد۔ اور یہ درخت اس یاد کا مظہر تھا۔

طبعی آثار و مظاہر سے وابستگی محسوسات کے خوگر انسان کی طبیعت میں داخل ہے۔ اگر یہ وابستگی دین کے کسی تقاضے سے نہ ٹکرائے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں ہوتا۔ قرآنی حقائق، رسول اللہ کا اُسوۂ حسنہ، (اپنے پیشرو خلیفہ حضرت ابوبکرؓ صدیق کا حضور نبیٔ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رحلت کے وقت ارشاد) اور اُممِ سابقہ کی تاریخ حضرت عمرؓ کے سامنے تھی۔ آپ جانتے تھے کہ اس قسم کے خطرات کی ابتداء معصوم انداز سے ہوا کرتی ہے لیکن آگے چل کر یہ مہیب تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ لہٰذا فتنے کے امکان کو ابتداء ہی سے کُچل دینے کا اصول اس کا مقتضی تھا کہ اس روش کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ لیکن اس کے حتمی طور پر ختم کرنے کا طریقہ تو ایک ہی تھا۔ اور وہ یہ کہ اس درخت کو جڑ سے کاٹ دیا جائے۔ غور کیجئے کہ حضرت عمرؓ کے لئے یہ فیصلہ کس قدر ہمت طلب اور جذبات آزما تھا۔ لیکن عمرؓ

صدا اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ ط..... ۵ (التوبہ آیہ ۱۱۲)

فاروقِ اعظمؓ کس طرح بنتا اگر دین کا تقاضا اس کے جذبات پر غالب نہ آجاتا۔ دین کا تقاضا جذبات پر غالب آگیا اور آپ نے یہ حکم دے دیا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے۔ درخت کاٹ دیا گیا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ انما ھلک من کان قبلکم بھذا یتبعون اٰثار انبیاءھم فاتخذوھا کنائس وبیعا۔

"تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ انہوں نے انبیاءؑ کے آثار کا اتباع شروع کر دیا اور اس کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہیں عبادت گاہیں بنا لیا"۔ (علامہ طنطاوی نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ اراکم ایھا الناس رجعتم الی العزّٰی "یعنی اے لوگو میں نے دیکھا کہ تم عزّٰی کی پرستش کی طرف لوٹ گئے ہو")۔ کیسی دُور رس تھی نگاہ اس حقیقت شناسؓ، دست پروردۂ رسالت مآبؐ کی!۔

فاروقِ اعظمؓ نے اس امکانی خطرہ کے پیشِ نظر اس درخت کو تو کٹوا دیا لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ بعد میں یہ اُمت "اس درخت کے بیجوں" کو جھولیاں بھر بھر کے لے جائے گی اور انہیں ساری دنیا میں اس طرح بکھیر دے گی کہ ایک ایک بیج سے سو سو پرستش گاہیں نمود میں آجائیں گی"۔

(شاہکارِ رسالت ص ۸۰-۷۹)

اس کے بعد آیئے دیکھیں کہ آج کے علمبردارانِ دین، جاہل قسم کے نیم تعلیم یافتہ مولوی نہیں، پی ایچ ڈی ڈاکٹر پروفیسر جو ساری دنیا میں کہتے پھرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی تحریک منہاج القرآن کا آغاز رسولؐ کے حکم سے کیا ہے کس طرح قوم کو اسی شجرۃ الزقوم کے پھل کھلانے کی ترغیب دلا رہے ہیں جسے قرآن، اس کے لانے والے رسول اعظمؐ اور اس

رسول اعظمؐ کے خلفائے راشدینؓ نے جڑ سے کاٹ کے پھینک دیا تھا۔ آیئے اور اس اشتہار پر نظر ڈالئے جو گراں قیمت ادا کر کے مسلسل کئی روز تک مقامی اخبارات میں شائع ہوتا رہا ہے۔ انصاف طلبی کے تقاضے اپنی جگہ بجا لیکن شخصیت پرستی کے ان مظاہر اور اپنے پرستیدگان کے القابات پر غور فرمایئے۔ کیا یہ اسی قرآن پر ایمان رکھنے والوں کا کردار ہے جس نے دنیائے انسانیت کی عظیم ترین ہستی کو ان الفاظ میں پکارا کہ وما محمد الا رسول اور کیا یہ اپنے تئیں اسی رسول اعظمؐ کے حکم سے قرآنی تحریک چلانے والوں کا کردار ہے۔ جس نے بار بار اپنی لسانِ مبارک سے فرمایا کہ انا بشر مثلکم اور یہ انہی خلفائے راشدینؓ کے نقوشِ قدم پر چلنے والوں کا کردار ہے جن میں سے پہلے نے کہا کہ یا ایھا الناس من کان یعبد محمدا فانہ قد مات اور دوسرے نے اس درخت کو کٹوا دیا جس سے شخصیت پرستی کے بیج زمانے میں پھیل سکتے تھے۔ ہاں یہ انہی کا کردار ہے جو قرآن کے نام پر قرآنی تعلیمات کو جھٹلا رہے ہیں۔ جو رسول اللہؐ کے نام پر آپ کے اسوۂ حسنہ کی اس جرأت کے ساتھ نفی کر رہے ہیں۔ ہاں یہ انہی کا کردار ہے جو خلفائے راشدینؓ کے نمونہ ہائے قابلِ صد تحسین اور ہزار فخر کے خلاف چلنے والے ہیں۔

قارئین کے علم میں آچکا ہوگا کہ انہوں نے اپنے ان اعلانات کے بعد اپنے مطالبات پورے نہ ہونے کی بنا پر یہ احتجاجی جلوس نکالا۔ جس کی وجہ سے اس روز ۱۲ جولائی ۱۹۸۸ء کے مظاہرے کی طرح وہ جو سیاسی اغراض کے تحت کیا گیا تھا جبکہ مظاہرہ اللہ اور اسکے رسولؐ کے نام پر کیا گیا ہے) ٹریفک میں مسلسل کئی گھنٹوں تک بے انتہا مشکلات پیدا ہوئیں۔ نہ معلوم کتنے شدید مریض اس "دینی خدمت" کے نتیجے میں، بروقت ہسپتال نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے کیسے کیسے جان لیوا مراحل سے گزرے ہوں گے، کتنے بچے بروقت دودھ کی سپلائی نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے کتنی ہی دیر بلبلا بلبلا کر روتے رہے ہوں گے، نہ معلوم کتنے ہی انسانوں کو اس بنا پر ایسے نقصانات اٹھانے پڑے ہوں گے جن کا ازالہ بمشکل ہی ہو سکے گا اور ان سب امکانات کے علاوہ، حکومت کو اپنے کارندوں کی کتنی بڑی فوج، اس سیلابِ بلا کو ساحلوں کے اندر رکھنے کے لئے، مقرر کرنا پڑی ہوگی تاکہ امن و امان کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں ان علمبردارانِ دین سے کہ ان کے نزدیک کوئی ایک انسان، دوسرے انسان سے یا کسی ایک انسان کی اولاد، کسی دوسرے انسان کی اولاد سے کون سے خدائی معیار کے مطابق مختلف ہوتی اور امتیازی سلوک کی حقدار بنتی ہے؟ کیا ان علمبردارانِ دین نے، وطنِ عزیز میں، ہر روز اغوا ہی نہیں، قتل ہو جانے والے دوسرے انسانوں کے لئے بھی اس قسم کے غیرتِ ایمانی کے احتجاجات اور مظاہرات کرنے تو کجا، ایسا کرنے کا کبھی سوچا بھی ہے کیوں کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے تو تمام انسانوں کو (بلا استثناء) واجب التکریم بنایا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ ٥ (بنی اسرائیل آیہ ۷۰)

"اور ہم نے ہر انسان کو (اولادِ آدم ہونے کی جہت سے) واجب التکریم بنایا ہے۔"

یہ علمبرداران دین، قوم کو، ارشادات ربانی، اسوۂ رسول اللہ اور اعمال خلفائے راشدین کے خلاف، کس قسم کی انتہائی ناروا شخصیت پرستی کی طرف لئے جا رہے ہیں اور حیرت ہے کہ پاکستان کے جملہ علمبرداران اسلام اور (بزعم خویش) محافظین ومتبعین اسوۂ رسول اعظم میں سے کسی ایک نے بھی اس کے متعلق ایک لفظ تک نہیں کہا۔ شاید اس لئے کہ یہ انہیں میں سے ایک کا عمل صالح ہے۔

"شخصیت پرستی کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں، انسانی زندگی کے تمام سہارے اس شخص کی ذات سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی موت سے یہ سب سہارے ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان اپنے آپ کو بے آسرا محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ اپنی بے کسی اور بے آسرگی، کا یہی احساس تھا جس سے مجبور ہو کر انسان نے اپنے آپ کو یہ فریب دے لیا کہ ایسی ہستیاں کبھی مرتی نہیں — وہ یا تو زندہ آسمانوں پر چلی جاتی ہیں اور اگر ہمارے سامنے مر بھی جاتی ہیں تو وہ درحقیقت مرتی نہیں، زندہ ہوتی ہیں اور ہماری ہر دعا کو سنتی ہیں اور مرادیں بہم پہنچاتی ہیں (اشتہار میں شہنشاہِ بغداد کے الفاظ پر غور کیجئے۔ یہ آنے والے کا انتظار" اور قبر پرستی کا شعار، اسی خود فریبی کے مظاہر ہیں[1] (شاہکار رسالت ۸)"

اللہ تعالیٰ نے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جن لوگوں کو تم نے اس سے ورے ہی اپنے معبود بنا رکھا ہے اور ان سے اپنی مرادیں مانگتے رہتے ہو، ان کی حالت یہ ہے کہ وہ تو اپنے نفع اور نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے، تمہاری دعاؤں کو پورا کرنا تو ایک طرف، وہ تو قیامت تک تمہاری دعائیں سن بھی نہیں سکتے۔ اس سے زیادہ گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر تم ان سے اپنی مرادیں مانگو۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ٥ (الاحقاف آیہ ۵)

"(ان سے کہو کہ) اس سے زیادہ راہ گم کردہ اور کون ہوگا جو خدا کو چھوڑ کر، ان ہستیوں کو پکارے جو قیامت تک ان کی پکار کا جواب نہ دے سکیں۔ حتیٰ کہ انہیں اس کا بھی علم نہ ہو کہ انہیں کوئی پکار رہا ہے۔"

---

[1] مذکورہ اشتہار میں "شہنشاہِ بغداد" کے الفاظ پر غور کیجئے۔ جنہیں بغداد میں "پیر ہندی" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

حیرت ہے کہ حکومت نہ صرف یہ کہ اس قسم کے احتجاجات اور مظاہرات کی اجازت دیتی ہے بلکہ ایسا کرنے والوں کے کندھوں پر دستِ شفقت رکھتی ہے! مقامِ شکر ہے کہ بانیانِ پاکستان علیہم الرحمۃ کہ جنہوں نے اس مملکت کو، اپنا خونِ جگر دے کر ہمارے جیسے نااہلوں کے لئے اسلئے حاصل کیا تھا کہ اس میں اللہ کا تختِ اجلال بچھایا جائے، آج یہ مناظر دیکھنے کے لئے زندہ نہیں ہیں ورنہ نہ جانے انہیں دیکھ کر ان کے دلوں سے کس قسم کی دردناک چیخیں نکلتیں؟

.... فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ (القمر آیہ ۱۴)

"کوئی ہے جو عبرت حاصل کرے"

(بقیہ حسن عباس رضوی از صفحہ ۵۶)

کی وجہ بھی یہی تھی کہ دن میں دفتر میں اپنی بساط سے بڑھ کر کام کرتے۔ اور رات قرآن حکیم پر تحقیق کرتے۔ ہمیں اُن کی وفات سے متعلق پورے واقعات کا علم نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے کچھ اسی قسم کی ضد کی ہو گی۔ اور اس پر مالکِ کون و مکاں کو اتنا پیار آیا ہو گا کہ اُنہیں اپنے پاس بلا لیا کہ لو بھئی رضوی اب جتنی چاہے قرآن کی باتیں کرو، کوئی نہیں روکے گا یہاں تمہارے احباب آرہے ہیں خوب محفل جمے گی۔ یہاں پر دیر ہے، اقبالؒ ہے، اور سب سے بڑھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اُن سے قرآن سمجھو۔ قلبِ مطمئنہ کی جلا کرو۔ تم میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے اور یہی صلاحیت سرمایۂ جنت ہے۔

اللہ اُنہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور ہم پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

عبدالغفور محسن
کوئٹہ

اکاؤنٹ نمبر 4107-35

جیب بنک لمیٹڈ۔ مین مارکیٹ برانچ۔ گلبرگ ۲ لاہور

احباب نوٹ فرمالیں

کہ ماسوائے رقوم اشتراک مجلہ طلوع اسلام تمام رقوم، ڈرافٹ اور چیک

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ــــ کے نام بھیجے جائیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی تعلیمات سے متعلق استفسارات!

"طلوعِ اسلام" کا آغاز ۱۹۳۸ء میں مفکرِ پاکستان حضرت علامہ محمد اقبالؒ کی زیرِ ہدایت یہ عرض کیا گیا تھا کہ مسلمانانِ ہند کے سامنے تحریکِ حصولِ پاکستان کی غرض و غایت اور اہمیت کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں پیش کیا جائے تاکہ اسے قومی مطالبہ کی شکل دی جا سکے۔

۱۹۴۰ء میں جب، قائداعظم محمد علی جناحؒ کی زیرِ قیادت، قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تو حضرت قائداعظمؒ نے فرمایا کہ ہمیں یہ جنگ تین محاذوں پر لڑنا ہے۔ انگریز سے، ہندو سے اور اُن اپنوں سے جو ہندوؤں کی کانگرس کے آلۂ کار بن کر، قال اللہ اور قال الرسولؐ کی آڑ میں، مخالفینِ ملتِ اسلامیہ کی صفوں میں شامل تھے۔ پہلے دو محاذ خالصتاً سیاسی تھے اور یہ قائداعظمؒ کے اپنے دائرۂ کار میں آتے تھے۔ جس کے لیئے علامہ اقبالؒ کی نگاہِ انتخاب ان پر پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ انہوں نے قائداعظمؒ کو یہ کہتے ہوئے، اسلامیانِ ہند کی اس ملّی جدّوجہد کی سربراہی سنبھالنے کے لیے ترغیب دی تھی کہ :-

"میں جانتا ہوں کہ آپ ایک انتہائی مصروف آدمی ہیں لیکن مجھے اُمید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا آپ پر گراں نہیں گزرتا ہوگا۔ (میرے اس اصرار اور تکرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت، ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کو اپنی یہ اُمیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں، جو یہاں آنے والا ہے، اُن کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔"

(مکتوب علامہ اقبالؒ بنام محمد علی جناحؒ مورخہ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء)

یہ تیر اقبالؒ کے دل سے نکلا اور سیدھا جناحؒ کے دل میں پیر گیا اور قائداعظمؒ، جو ہندی سیاست میں ہندوؤں اور کانگریس کے طرزِ عمل سے مایوس ہو کر، ہندوستان کو خیرباد کہہ کر، مستقلاً انگلستان میں اقامت پذیر ہو چکے تھے، واپس ہندوستان تشریف لائے اور اسلامیانِ ہند کی اس ملّی جدوجہد کی قیادت

سنبھالی۔ یہ اُسی رہبرِ فرزانہ کی غیر منقطع، انتھک اور سرفروشانہ مساعی کا نتیجہ ہے کہ مملکتِ پاکستان وجود میں آئی۔ مسلمانانِ ہند کی اس ملّی جنگ کی قیادت کے لیے حضرت قائدِ اعظمؒ کا انتخاب حضرت علامہ اقبالؒ کا ملّتِ پاکستانیہ پر ایک ایسا احسانِ عظیم ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ کبھی بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

نیشنلسٹ علماء کی مذکورہ مخالفت کے مقابلہ میں تحریکِ حصولِ پاکستان کی مدافعت اور دین کے نقطۂ نگاہ سے پاکستان کی ضرورت اور اہمیت کو قوم کے سامنے پیش کرنے کے محاذ کی سربراہی کا قرعۂ فال محترم پرویزؒ صاحب کے نام پڑا۔ انہوں نے جس کامیابی سے اس محاذ کو سنبھالا، اس نے قائدِ اعظمؒ کو مکمل طور پر انگریز اور ہندوؤں سے نمٹنے کے لیے فراغت بہم پہنچائی۔

محترم پرویزؒ صاحب کی سرکردگی میں، طلوعِ اسلام نے جس تندہی اور کامیابی سے اس فریضہ کی ادائیگی کی۔ طلوعِ اسلام کے فائل اس پر شاہد ہیں اور ان مساعیٔ جمیلہ کی وجہ سے قائدِ اعظمؒ کے نزدیک محترم پرویزؒ صاحب کا کیا مقام تھا۔ اور قائدِ اعظمؒ کو محترم پرویزؒ صاحب پر کتنا گراں بہا اعتماد تھا۔ اس کا ثبوت قائدِ اعظم کا وہ گرامی نامہ ہے جو تقسیمِ ہند کے اعلان کے بعد، محترم پرویزؒ صاحب کی طرف سے قائدِ اعظم کو مبارکباد کے جواب میں انہوں نے تحریر فرمایا اور جو قوم کے سامنے مناسب وقت پر پیش کیا جائیگا۔

۱۹۴۷ء میں، قیامِ پاکستان کے بعد، طلوعِ اسلام نے اپنے ذمہ یہ فریضہ لیا کہ جس قرآنی نظام کے قیام کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا ہے، اس کے خدّ و خال، قوم کے سامنے پیش کرے۔ اور اس طرح طلوعِ اسلام اپنے تیسرے دور میں ۱۹۴۸ء میں کراچی پر منظرِ عام پر آیا۔ محترم پرویزؒ صاحب نے اپنی زندگی کے ہر سانس میں یہ فریضہ بطریقِ احسن ادا کیا۔ اُن کی متعدد تصانیف، سینکڑوں پمفلٹ، درس ہائے قرآنِ کریم، تقاریر اور خطابات، اللہ کی کتابِ عظیم قرآنِ حکیم کو اس کی خالص اور منزّہ شکل میں پیش کرنے کی مساعی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ تمام تفاصیل حکومتِ پاکستان کی تیار کردہ اس ڈاکومنٹری فلم (DOCUMENTARY FILM) میں محفوظ ہیں، جو تقریباً چھ ماہ میں لاہور ٹیلی وژن نے مکمل کی تھی اور جو ابھی تک قوم کے سامنے پیش نہیں کی گئی۔ دورِ ملوکیت کے ایجاد کردہ ہمارے مروّجہ (اقبالؒ کے الفاظ میں) عجمی اسلام کے علمبرداروں کی ہزارہا مخالفتوں کے علی الرغم، آج ہماری فضاؤں میں قرآن کی آواز، اسی مفکرِ قرآن کی کوششوں کی صدائے بازگشت ہے۔

پاکستان ہی میں نہیں، پورے عالمِ اسلام میں، قرآنِ خالص کی آواز اور محمد رسول اللہ اور

(بقیہ بر صفحہ ۳۲)

عبدالغفور محسن
کوئٹہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حسن عباس رضوی

ایک تحریک آفریں شخصیت جو ہم سے جُدا ہو گئی!

ابھی محترم پرویز صاحب کی جدائی کا زخم مندمل نہیں ہوا کہ اُسی گھاؤ پر مسلسل چوٹیں لگ رہی ہیں۔ دیرینہ ہمدم مدتِ عمر پوری کرتے اور ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ ہر ماہ طلوعِ اسلام میں کسی نہ کسی کی وفات کی اطلاع آجاتی ہے اور دل کی دنیا میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بار جو جانکاہ چوٹ لگی وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ خدا ایں سخت جاں رایار بادا۔ محترم حسن عبّاس رضوی بھی جنّت مکانیوں میں شامل ہو گئے ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہوئی۔ دنیا تو ختم نہیں ہوئی۔ طور سوزاں رہے گا اور کلیم آتے رہیں گے۔ لیکن ایک چُنتی پھرتی انجمن مُنہ ڈھانپ لے تو کیا سناٹا نہ چھا جائے گا؟ اب وہ خوبصورت، خوب سیرت، خوش لباس اور خوش اطوار رضوی کہاں سے آئے گا جو بات کرے تو سب ہمہ تن گوش ہو جائیں۔ قہقہہ لگائے تو محفل شگفتہ ہو جائے اور آیاتِ قرآنی کی تفسیر کرنے لگے تو معلوم ہو کہ ابھی پرویز صاحب زندہ ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

کوئٹہ میں بزم ۱۹۵۶ء میں قائم ہوئی۔ رضوی صاحب مرحوم ۱۹۵۷ء میں یہاں تشریف لائے۔ اور چونکہ پتہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، بزم کے ہفتہ وار اجلاس میں شریک ہوئے۔ رکھ رکھاؤ میں معزز اور بات چیت میں اپنے اپنے سے لگے۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہیں اور نام ہے حسن عبّاس رضوی۔ محترم پرویز صاحب کہا کرتے تھے یہ نام تو سہ آتشہ ہے)۔ ابتدائی چند اجتماعات میں ہی اُنہوں نے اپنی اہمیت تسلیم کرالی اور بزم کے روحِ رواں بن گئے۔ لیکن پہلی بار وہ زیادہ عرصہ کوئٹہ میں نہیں رہے ایک سال کے اندر اندر ہی واپس لاہور چلے گئے۔ دوسری بار ۱۹۶۰ء میں آئے۔ اور پھر جم کر رہے۔ یہ وہ دَور تھا جب بزم کوئٹہ کے پاس ٹیپ ریکارڈر نہیں تھا۔ اور نہ ہی ہم پرویز صاحب کا درس باقاعدگی سے سُن سکتے تھے۔ اس کمی کو رضوی صاحب نے پورا کیا۔ اراکین بزم کی درخواست پر انہوں نے مختلف موضوعات پر تقاریر کا سلسلہ شروع کیا جو کم و بیش چار سال تک چلتا رہا۔ انہیں فی البدیہہ بولنے پر مہارت حاصل تھی لیکن قرآنِ حکیم کے حقائق پر محض بولنا تو کافی نہیں ہوتا۔ ایک ماہر غوّاص کی طرح بحرِ ذخّار کی تہہ سے موتی تلاش کر کے لانا ہوتے ہیں اور یہ خیال رکھنا ضروری

ہوتا ہے کہ قرآن خالص سامنے آئے اور صدیوں سے پڑا ہوا جھاڑ جھنکاڑ الگ ہٹا دیا جائے۔ چند ہی ہفتوں بعد یہ ثابت ہو گیا کہ رضوی صاحب ایسے ہی ماہر غواص ہیں۔ ہر ہفتہ تقریر باندازِ درس ہوتی رہی اور حاضرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ انہوں نے یہ شرف مجھے بخشا کہ میں ہر ہفتہ اُن کی تقاریر کے نوٹس لیا کروں۔ اور اگلے ہفتے درس کی ابتدا سے قبل انہیں مختصراً منضبط کر کے سنایا کروں تاکہ تسلسل قائم رہے۔ آخری بار جب وہ لاہور ٹرانسفر ہو گئے تو یہ نوٹس ساتھ لے گئے وہ ان پر مشتمل ایک مستقل تصنیف کا ارادہ رکھتے تھے۔ (معلوم نہیں ہو سکا کہ اُن کی خواہش پوری ہوئی یا نہیں) اِن تقاریر میں "قرآن فہمی کے اصول" کے عنوان سے نو یا دس تقاریر ایسی تھیں جو تحقیق کا اعلیٰ ترین نمونہ کہی جا سکتی تھیں۔ ان تقاریر کے دوران سامعین میں سے کوئی کھانسا بھی گوارہ نہ کرتا کہ مبادا کچھ سننے سے رہ جائے۔

۱۹۶۵ء کی ابتدا میں کوئٹہ بزم کو سب کنونشن اور محترم پرویز صاحب کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا جیسا کہ احباب جانتے ہیں یہ بزم چند قلیل المشاہرہ ملازمین پر مشتمل تھی اور ہے۔ اس موقع پر یہ سوال باعثِ پریشانی رہا کہ اخراجات سے کیونکر عہدہ برآ ہوا جائے۔ یوں تو مالی مسائل تقریباً ہر بزم کے لئے دردِ سر بنے رہتے ہیں، لیکن ہمارے لئے یہ مسئلہ دردِ جگر بنا ہوا تھا۔ اتفاقاً کسی نے کہا کہ "میں چائے کا سیٹ گھر سے لاؤنگا"۔ رضوی صاحب اُچھل پڑے اور بولے "پھر محض چائے کا سیٹ ہی کیوں"۔ مسئلہ حل ہو گیا۔ بات تشویش سے شروع ہوئی اور قہقہوں پر ختم ہوئی۔ چنانچہ کرسیاں، میز، چارپائیاں بستر، برتن۔ غرضیکہ سب کچھ گھروں سے مہیا ہوا۔ ہر ایک اپنی اپنی بساط کے مطابق لے آیا۔ اس طرح اخراجات جو اٹھے وہ محض کھانے کے تھے جس کا بیشتر حصہ پہلے ہی شمولیت کرنے والے اراکین نے حسبِ معمول بھیج دیا تھا۔ اس بندوبست کا تذکرہ جب محترم پرویز صاحب سے کیا گیا تو انہوں نے بھی مسرت کا اظہار کیا۔ اور یوں یہ غریب سی بزم ایک عظیم کام سے عہدہ برآ ہو سکی۔ رضوی صاحب اسے دورِ اوّل کے ایثار سے مماثل کیا کرتے تھے اور اس پر نازاں تھے۔ اس سب کنونشن کے سلسلہ میں دوسرا اہم واقعہ انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اراکین تمام دوست احباب اور اہم شخصیتوں کو محترم پرویز صاحب کے درس میں شمولیت کی دعوت کارڈ کی صورت میں دے چکے تھے اور یہ درس کوئٹہ کے ٹاؤن ہال میں ہونا تھا جس کی اجازت حاصل کی جا چکی تھی لیکن درس سے عین ایک دن قبل حکام نے پرویز صاحب کی شخصیت کو متنازعہ فیہ قرار دیتے ہوئے یہ اجازت منسوخ کر دی اس پر ہم بہت پریشان ہوئے کچھ احباب تو آپے سے باہر ہو گئے لیکن باباجیؒ کے سمجھانے سے یہ غصہ تعمیری شکل اختیار کر گیا اور رضوی صاحب نے یہ فیصلہ کر دیا کہ تمام کارروائی ان کے سرکاری کوارٹر میں ہو گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ تمام اجلاس کوارٹر کے چھوٹے سے لان میں ہوئے۔ سامعین میں سے جنہیں کرسیاں مل گئیں وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے باقی نے زمین پر بیٹھ کر

یا کھڑے ہو کر درس سنتے۔ اس بندوبست میں رضوی صاحب کی بیگم اور بچے بھی پوری طرح متعاون رہے اور انہوں نے گھر کی ہر چیز بزم کی DISPOSAL پر چھوڑ دی۔

سب کوشش سے کچھ دن پہلے طاہر ابرار انصاری مرحوم کی کوشش سے بزم کو ٹیپ ریکارڈر میسر آگیا تھا۔ اور پرویز صاحب کے درس باقاعدگی سے سنے جانے لگے تھے۔ اب اہتمام یہ ٹھہرا کہ پہلے درس سنا جاتا اس کے بعد کسی بھی اہم مسئلہ پر رضوی صاحب کا خطاب ہوتا یا پھر کوئی سامع اگر تشنگی محسوس کرتا تو رضوی صاحب اس تشنگی کو دور کرنے کے لئے تفصیل سے بات سمجھا دیتے۔ یہ مجالس بسا اوقات رات گئے تک چلتیں اور یوں اراکین بزم اور سامعین نے حکمت قرآنی سے جھولیاں بھر لیں۔ یہ خیرات، رضوی صاحب بانٹا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ اُن کی کوئٹہ سے آخری بار روانگی تک جاری رہا۔ اُن کے جانے کے بعد باقاعدہ تقاریر سلسلہ تو نہ چل سکا لیکن درس کے بعد افہام و تفہیم کی رضوی صاحب والی سنت اب بھی جاری ہے اور نمائندہ بزم قدیر احمد خان (خدا انہیں عمر دراز عطا کرے) اس فرض کو بطریق احسن ادا کر رہے ہیں۔

رضوی صاحب کی نجی زندگی کے متعلق ہمیں بہت کم معلوم ہے، وہ اس سلسلے میں بہت کم بولتے تھے۔ کبھی کبھی اتفاقاً کچھ معلوم ہو جاتا تھا۔ مثلاً۔ نفسیات میں ایم اے کیا تھا۔ کرکٹ کے اچھے کھلاڑی تھے کیپٹن بھی رہے اور رائفل ٹرافی وغیرہ میں شرکت کی اور قرآن سے لگاؤ انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ اُن کے گھریلو حالات مثالی تھے۔ بیگم صابر وشاکر، بچے متعاون اور احباب کا حلقہ مختصر لیکن اہل علم پر مبنی دفتر میں کام کرنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی ہدایات کو سامنے رکھتے انہیں فکر قرآن کی وجہ سے گوناگوں مشکلات پیش آئیں۔ لیکن انہوں نے تمام مصائب کا مردانہ وار ہنستے مسکراتے مقابلہ کیا۔ جہاں کوئی بات قرآن کے خلاف نظر آئی ٹوک دیا اور یہ بات دفاتر کے کارکنانِ قضا و قدر کہاں برداشت کرتے ہیں۔ رضوی صاحب اس معاملے میں سمجھوتہ کے قائل نہ تھے۔ قیام لاہور کے دوران وہ ریڈیو پر پنجابی پروگراموں میں ہلکے پھلکے انداز میں قرآن پیش کرتے رہے اور اس کا اچھا خاصا اثر ہوا۔ اُن کی ہنسی بڑی پیاری تھی ہنستے تو محفل اُن کے ساتھ اس ہنسی میں شریک ہو جاتی۔ محترم پرویز صاحب اُن کے سمجھنے اور سمجھانے کے انداز سے بہت خوش تھے۔ اور اُن کے بعد درس کے لئے ہماری نگاہیں اُن کی طرف اُٹھتی تھیں۔ لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا کہ انہوں نے جانے میں بڑی جلدی کی۔

عارضۂ دل نے انہیں ایک بار کوئٹہ میں بھی پریشان کیا تھا اور انہیں ہسپتال میں رہنا پڑا تھا لیکن انہوں نے اسے ہنسی میں اڑا دیا۔ جب دوست احباب ہسپتال میں اُن کی مزاج پرسی کے لئے جاتے تو کسی نہ کسی بہانے قرآن پر بات چل نکلتی۔ بیگم جو اُن کی دیکھ بھال کے لئے وہاں موجود رہیں وہ انہیں یاد دلاتیں کہ "آپ کو ڈاکٹر نے باتیں کرنے سے منع کیا ہے" کہتے بس صرف ایک بات اور وہ ایک بات لمبی ہوتی چلی جاتی۔ اور بیگم صاحبہ کو ڈاکٹر سے شکایت کرنا پڑتی۔ قرآن حکیم کے معاملے میں وہ ضدی واقع ہوئے تھے۔ کوئٹہ میں علالت

بقیہ بر صفحہ ۵۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد و نظر

نام کتاب ۔ تحریکِ پاکستان (نوائے وقت کے اداریوں کی روشنی میں)
مرتّب ۔ سرفراز حسین مرزا۔
شائع کردہ ۔ پاکستان سٹڈی سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور
صفحات ۔ ۹۴۲ ۔ قیمت =/۲۵۰ روپے

ہمارے بہت سے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے قیامِ پاکستان کی سخت مخالفت کی تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، انہوں نے عوام کے روایتی کمزور حافظے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے کہ اس مملکت کا قیام، ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ حال ہی میں، ایف اے کے مضمون اسلامیات کی ایک نصابی کتاب راقم کی نظر سے گزری۔ جس میں قیامِ پاکستان کے بارے میں سرے سے قائدِ اعظمؒ کا ذکر تک نہیں، اس کی بجائے اس کے قیام کا سہرا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے سر باندھنے کی کوشش کی گئی تھی، جنہوں نے قیامِ پاکستان کی سخت مخالفت کی تھی۔ اس قسم کی مذموم کوششوں کے تدارک کے لئے ضروری ہے کہ اس دور کی مستند تاریخ کو عامۃ الناس کے سامنے لایا جائے تاکہ کوئی بھی سیاسی جماعت انہیں مزید بے وقوف نہ بنا سکے۔

ہماری یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر کوئی مستند کتاب عوام کی رہنمائی کیلئے شائع نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ نظریۂ پاکستان کے دشمن نوجوان نسل کے ذہنوں میں قیامِ پاکستان کے بارے میں الجھنیں پیدا کرنے میں مصروف ہیں، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے پنجاب یونیورسٹی کے ایک ریسرچ سکالر جناب سرفراز حسین صاحب نے 'تحریکِ پاکستان' کے عنوان سے ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اس میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے، انہوں نے اس میں روزنامہ نوائے وقت، لاہور کے اس دور کے یعنی قیامِ پاکستان سے پہلے کے دور کے اداریوں کو ایک خوبصورت طریقے سے مرتب کر دیا ہے۔ اس کتاب میں پاکستان کے قیام کے لئے جدّوجہد کرنے والوں کی کوششیں بھی سامنے آجاتی ہیں اور اس کی مخالفت کرنے والوں کا کردار بھی بے نقاب ہو جاتا ہے یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے پاکستان سٹڈی سنٹر کی جانب سے شائع کی گئی ہے۔

قیام پاکستان کے لئے جدّوجہد کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہی ہو گیا تھا۔ اس وقت مسلمان اپنی سیاسی طاقت کے کھو جانے کی وجہ سے سخت پریشانی اور افراتفری کی حالت میں تھے، ہندوؤں نے ان کی اس حالت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان کا قومی تشخّص ختم کر کے انہیں ہندو قوم میں ختم کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس وقت مسلمانوں کے مشہور ہر دلعزیز لیڈر سرسیّد احمد خان سیاسی اُفق پر نمودار ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ناپاک عزائم سے خبردار کیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ مسلمان اور ہندو دو علیحدہ قومیں، جن کا اپنا اپنا علیحدہ مذہب اور کلچر ہے اور اس طرح انہوں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا۔

یہ سرسیّد احمد خان کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ بعد میں مسلمانانِ ہند نے اپنے لئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا اور آخر کار ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے ستائیسویں سالانہ اجلاس میں قراردادِ پاکستان منظور کی۔ اس قرارداد کے پاس ہونے پر ہندو لیڈر تلملا اُٹھے۔ پہلے ہی کچھ مسلمان رہنما کانگریس میں شامل ہو چکے تھے۔ ان کی مدد سے ہندو نے مسلمانوں کی دوسری سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کا پروگرام بنایا۔ جس میں اسے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس وقت مسلم مجلس، جمیعت علمائے ہند، مجلس احرار، خاکسار، جماعتِ اسلامی اور مومن کانفرس مسلمانوں کی جماعتیں تھیں۔ ان جماعتوں کی قیادت مسلمان علماء کے ہاتھوں میں تھی۔ لیکن وہ ہندوؤں کی چالاکی کو نہ سمجھ سکے۔ چنانچہ ہندوؤں نے مسلم لیگ کی سیاسی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے ان علماء حضرات کے تعاون سے قائدِاعظم اور دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کی کردار کشی شروع کی۔ اس سلسلے میں ان علماء کے بیانات کو اُردو اخبارات میں جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ تمام اخبارات ہندو کانگریس کے زیرِ اثر تھے، مسلم لیگ کا ترجمان صرف ایک ہفتہ وار اخبار ایسٹرن ٹائمز تھا۔ لیکن انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ سے مسلم عوام کی پہنچ سے دور تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے ایک اُردو قومی روزنامے کی ضرورت کو شدّت سے محسوس کیا جا رہا تھا تاکہ ایک تو وہ مسلم عوام کے سامنے مسلم لیگ کا صحیح نقطۂ نظر پیش کرے اور دوسرے قائدِاعظمؒ اور مسلم لیگ کے دوسرے لیڈروں کی جو کردار کشی کی جا رہی ہے، اس کا مناسب تدارک کرے۔ اس مقصد کے لئے خود قائدِاعظمؒ نے قوم سے اپیل کی۔ ان کی اپیل پر لبیک کہتے ہوئے جناب حمید نظامی صاحب نے اپنے ہفتہ وار رسالے نوائے وقت، کو ۲۷ جولائی ۱۹۴۲ء کو ایک روزنامہ میں تبدیل کر کے شائع کرنا شروع کیا۔ اس اخبار نے مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں پر ہونے والے حملوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ اس نے مسلم لیگی لیڈروں کے بیانات کے صحیح صحیح متن شائع کئے۔ اخبار نے مسلم لیگ کے نظریات مسلمان عوام

تک اس خوبصورتی سے پہنچائے کہ خود قائداعظمؒ خوش ہو گئے اور انہوں نے دو تین مرتبہ اس اخبار کے ایڈیٹر کو مبارک باد کے پیغامات پہنچائے۔

قیامِ پاکستان سے تین سال پہلے اس اخبار نے جو اداریے شائع کئے اس میں مخالفین پاکستان کے اعتراضات اور عزائم بد کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ تحریکِ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریے پر قائم کی گئی تھی چنانچہ یہ ایک فطری بات تھی کہ اداریوں میں اس نظریئے کے مخالفوں کا تعاقب کیا جائے۔ ان مخالفوں میں مولانا ابوالکلام آزاد مولانا حسین احمد مدنی، مولانا داؤد غزنوی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر خان صاحب، خان عبدالغفار خان، اور شیخ حسن دین شامل تھے۔ ملک میں جو سیاسی پیش رفت ہو رہی تھی، مسلمانوں کے لئے اس کے فوائد اور نقصانات کا تجزیہ کر کے، اخبار نے اپنے اداروں میں مسلمان قوم کی اس نازک موقع پر صحیح رہنمائی کی۔ جن مسائل پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں راج گوپال اچاریہ فارمولا، سپرو کمیٹی، لارڈ ویول اور ہندوستانی سیاست، کیبنٹ مشن، عارضی مرکزی حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت اور تین جون کا حکومتِ برطانیہ کا اعلان شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف صوبوں میں خاص طور پر کشمیر میں جو کچھ ہو رہا تھا، ان اداریوں کے مطالعہ سے ان کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اور سب سے بڑی چیز جس کی موجودہ نسل کو اشد ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ان اداریوں کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس نے پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا اور کون اس کے مخالف تھے۔

ایک استاد کی حیثیت سے راقم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہماری نوجوان نسل کے ذہنوں میں کس قسم کے سوال پیدا ہو رہے ہیں۔ خود تعلیمی اداروں میں بعض اساتذہ کی جانب سے نوجوانوں کے ذہنوں کو قیامِ پاکستان کے بارے میں مسموم کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ جناب سرفراز حسین صاحب کی یہ کوشش، ان کے ذہنوں سے اس قسم کے بداثرات دور کرنے میں کامیاب ہو گی بشرطیکہ یہ کتاب ان تک پہنچانے کا انتظام ہو سکے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حکومت ہر تعلیمی ادارے کیلئے اسکی کتاب کی خرید کو لازمی قرار دے دے۔

اس کوشش کے مثبت نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے راقم یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ روزنامہ امروز کے پہلے تین چار رسالوں کے اداریوں کو بھی اسی نہج پر مرتب کر کے شائع کیا جائے تو اس سے بھی نئی نسل کی تحریکِ پاکستان کے بارے میں صحیح رہنمائی ہو سکے گی۔ روزنامہ امروز کو شائع کرنے والے ادارے پریس ٹرسٹ کے پاس ذرائع کی کمی نہیں۔ امید ہے میری اس تجویز پر غور کیا جائے گا۔

محمد ارمغان ثاقب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقائق و عبر

۱۔ قربانی کے جواز کے لئے ضعیف ترین حدیث کا سہارا

ملک عزیز میں جتنے دینی اور مذہبی اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں ان کے جولائی کے شماروں میں قربانی کی اہمیت کے بارے میں مضامین شائع ہوئے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ ان تمام مضامین میں قربانی کو مسلمانوں کے لئے فرض ثابت کرنے کے لئے مندرجہ ذیل حدیث کا سہارا لیا گیا ہے:۔

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نحر کے دن (یعنی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو کوئی بھی عمل اللہ کے نزدیک (قربانی) کا خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں قربانی کرنے والا قیامت کے روز قربانی کے جانور اس کے بال اور اس کے کھروں سمیت آئے گا۔ (یعنی قربانی کے ان بے مصرف اجزاء کو بھی نیکی کی میزان میں تولا جائے گا) اور خون زمین پر گرنے سے پہلے ہی اللہ کے نزدیک (رضا اور مقبول) کی جگہ لے لیتا ہے، پس خوشی خوشی قربانی کرو۔"

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(بحوالہ ہفت روزہ اہلحدیث لاہور، بابت ۲۹ جولائی ۱۹۸۸ء صفحہ ۶)

قربانی کے بارے میں جتنی احادیث ہیں، امام ابن حزم نے انہیں ضعیف ثابت کیا ہے اور ہر حدیث کے ضعیف ہونے کا سبب بھی بیان کیا ہے (المحلی لابن حزم جلد ہفتم صفحہ ۳۵۷) لیکن جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے وہ ان تمام احادیث میں سے ضعیف ترین ہے کیونکہ اس کے چاروں راوی ضعیف ہیں۔ ان راویوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ عبدالرحمٰن بن ابراہیم ۲۔ عبداللہ بن نافع

۳۔ ابوالمثنیٰ ۴۔ ہشام بن عمروہ

اب ان راویوں کے بارے میں ائمہ حدیث کا فیصلہ سنیئے۔ عبدالرحمٰن بن ابراہیم نام کے چار راوی ہیں اور چاروں ضعیف ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد دوم صفحہ ۵۴۵)

دوسرے راوی عبداللہ بن نافع کو بعض محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ لیکن امام بخاری اور امام احمد بن حنبل نے اسے غیر معتبر قرار دے دیا تھا (ایضاً صفحات ۱۴-۱۳) تیسرے راوی کے بارے میں ائمہ حدیث کا فیصلہ یہ ہے۔ کہ اس کی صرف وہ روایات قبول کی جائیں۔ جن سے اس موضوع پر دوسری روایات کی تائید ہوتی ہو۔ (ایضاً جلد چہارم صد۵۶۹) اور اس موضوع پر کوئی دوسری روایات ہی نہیں۔ چوتھے راوی کا کسی زمانے میں علمائے حدیث میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن آخری عمر میں وہ مختلف احادیث کے متن میں گڑبڑ کر جاتے تھے وہ بادشاہوں کے درباروں میں حاضر ہونا اپنے لئے سعادت سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے خلیفہ المنصور کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہا۔ تو انہوں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا کہ ایسا کرنا علماء کی شان کے خلاف ہے (ایضاً جلد چہارم صفحات ۳۰۱، ۳۰۲) صرف اخبارات و رسائل میں ہی اس کمزور ترین حدیث کا سہارا نہیں لیا گیا بلکہ تمام علماء نے اسی حدیث کے حوالے سے قربانی کو ہر مسلمان کے لئے فرض ثابت کیا۔ خیال رہے کہ اگر کسی حدیث کا ایک راوی بھی کمزور ہو تو اسے ضعیف قرار دے دیا جاتا ہے اور اس حدیث کے تو چاروں راوی ضعیف ہیں۔ اسلئے یہ اس موضوع پر تمام احادیث سے زیادہ کمزور ترین حدیث ہے۔

۲- حج پر قربانی

حج پر قربانی کے بارے میں فرقہ اہلحدیث کا ایک ہفت روزہ الاعتصام اپنی ۲۶ جولائی ۱۹۸۸ء کی اشاعت کے صفحہ اول پر لکھتا ہے:-

> منیٰ کے میدان میں جب ہر حاجی اپنی قربانی کا جانور ذبح کرتا ہے تو اس "ذبح عظیم" اسماعیل علیہ السلام کی بے مثال اطاعت شعاری اور سرفگندگی کی سنت کا اظہار ہوتا ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سبحان اللہ العظیم۔!
>
> آئیے ہم ذرا اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم ہر سال قربانیوں پر بے پناہ رقمیں خرچ کر کے گوشت کا سامان تو کر لیتے ہیں مگر کیا ان تینوں عظیم المرتبت ہستیوں کے کردار عمل اور ایمان و تقویٰ کی کوئی جھلک اپنے اندر پاتے ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی ہر متاع عزیز کو قربان کر دینے پر تیار ہو سکتے ہیں"؟
>
> ہفت روزہ الاعتصام لاہور بابت ۲۶ جولائی ۸۸ء صفحہ ۳ (۶۶۷)

حیرت کی بات ہے کہ اہل حدیث فرقے کے بڑے بڑے علماء کو اس شرعی حکم کا علم نہیں کہ قربانی حج کا

رکن نہیں اور نہ ہی سارے حاجی قربانی کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے اس بارے میں شرعی احکامات کا کبھی مطالعہ نہیں کیا تو کم از کم اخبارات ہی دیکھ لیتے۔ پچھلے سال تقریباً بیس لاکھ حاجیوں نے حج ادا کیا تھا لیکن صرف تین لاکھ اور چونسٹھ ہزار حاجیوں نے قربانی کی تھی۔ اس سال سولہ لاکھ حاجیوں نے یہ فریضہ ادا کیا اور صرف پانچ لاکھ حاجیوں نے قربانی کی اور یہ قربانی بھی، حضرت ابراہیمؑ کی سنّت والی قربانی نہیں تھی بلکہ حج تمتع کا نقص دور کرنے کے لئے جانور ذبح کئے گئے تھے۔ خیال رہے کہ قربانی صرف حج قرآن کے لئے لازمی ہے رسول اللہ صلعم نے یہی حج ادا کیا تھا۔ اس حج میں حج اور عمرہ کے لئے اکٹھا احرام باندھا جاتا تھا۔ اس حج میں چونکہ مشقت اُٹھانی پڑتی ہے اس لئے ہمارے ملک سے کوئی حاجی بھی یہ حج ادا نہیں کرتا۔ حج کی دوسری قسم حج افراد ہے۔ جس کے لئے کسی قسم کی قربانی کی ضرورت نہیں، تیسری قسم حج تمتع ہے، ہمارے ملک کے لوگ زیادہ تر یہی حج ادا کرتے ہیں، اس حج کو حج کی ناقص قسم سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کے نقص کو دور کرنے کے لئے قربانی کی جاتی ہے اور یہ قربانی بھی ضروری نہیں بلکہ اس کی بجائے دس دن کے روزے بھی رکھے جا سکتے ہیں اور اس بارے میں قرآن مجید میں یہ واضح حکم ہے۔ (ترجمہ) "پس جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ تو قربانی سے جو بھی اسے میسّر آجائے کرے اور جسے میسّر نہ ہو، پس وہ حج کے دنوں میں تین دن کے روزے رکھے اور جب واپس آجاؤ، تو سات دن کے روزے رکھو۔ یہ سب مل کر دس دن ہوئے، یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جس کے اہل و عیال مسجد الحرام (مکّہ مکرمہ اور اس کے مضافات) کے رہنے والے نہ ہوں۔"

(سورۃ البقرہ - ۱۹۶)

ان تفصیلات کی روشنی میں فرقہ اہل حدیث کے نیم تعلیم یافتہ علماء کو امام ابن حزم کہ جس کی کتاب المحلی کا وہ اردو ترجمہ شائع کر رہے ہیں، کے بارے میں فتویٰ کی سمجھ آجائیگی۔ وہ فرماتے ہیں۔

وَكَانَ عُمَر يحج وَلَا يضحي وَكَانَ اصحابنا يحجون معهم الورق وَالذهب وَلَا يضحون۔

ترجمہ:- حضرت عمر فاروقؓ حج ادا کرتے تھے لیکن کوئی قربانی نہیں کرتے تھے۔ اس طرح ہمارے رفقاء جو فریضہ حج ادا کرتے تھے، لیکن سونا چاندی ہونے کے باوجود قربانی نہیں کرتے تھے۔

(المحلی لابن حزم جلد ہفتم صفحہ ۳۷۵)

لیتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

"مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملنے کے لئے مکہ تشریف لے گئے اور جلد واپس ہونے کا ارادہ تھا۔

جب حضرت اسماعیل علیہ السّلام کے گھر پر دستک دی۔ تو اسماعیل علیہ السّلام کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ ابراہیم علیہ السّلام نے اسماعیل علیہ السّلام کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔

ابراہیم علیہ السّلام نے فرمایا کہ بتاؤ گھر کا انتظام کیسے چل رہا ہے۔ حالات کیسے گذر رہے ہیں۔ بہو نے حالات کا شکوہ کیا۔ کچھ گھر کا رونا رویا۔

ابراہیم علیہ السّلام نے اس سے کہا کہ جب اسماعیل علیہ السّلام آجائیں تو اسے کہہ دینا تمہارے گھر کی دہلیز صحیح نہیں ہے۔ اس کو تبدیل کر دو۔ یہ کہہ کر ابراہیمؑ وہاں سے چلے گئے۔

جب اسماعیل علیہ السّلام اپنے گھر تشریف لائے تو بیوی نے اس کو کہا کہ اس صورت کے ایک بزرگ آپ سے ملنے آئے تھے۔ لیکن آپ اس وقت سفر پر تھے۔

اسماعیل علیہ السّلام نے فرمایا کہ اس نے کیا کہا۔ بیوی نے کہا کہ وہ بزرگ کہہ گئے ہیں کہ اسماعیلؑ کو کہہ دینا کہ گھر کی دہلیز تبدیل کر دینا۔ یہ اچھی معلوم نہیں ہوتی۔

اسماعیلؑ نے بیوی سے کہا کہ اس بزرگ نے تمہارے ساتھ کوئی کلام کیا تھا۔ تم سے کچھ پوچھا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھ سے گھر کے حالات وغیرہ پوچھے تھے۔ میں نے اس کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ آجکل بڑے تکلیف سے دن کٹ رہے ہیں۔

۳۔ حضرت اسماعیلؑ کا واقعہ

قرآن مجید نے شادی کو مرد اور عورت کے درمیان ایک مضبوط معاہدہ قرار دیا ہے۔ اور اس بندھن کو قائم رکھنے کے لئے ایسی ہدایات دی ہیں کہ شاذ و نادر ہی زوجین میں علیحدگی کا سوال پیدا ہو۔ لیکن ہمارے علماء شادی کے اس پاکیزہ رشتے اور بندھن کو کھڑے کھڑے ختم کر دینے کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک مرد جب چاہے، بیوی کو بیک بینی و دوگوش گھر سے نکال دے۔ اس مقصد کے لئے وہ جن واقعات کا سہارا

اسماعیل علیہ السلام نے کہا کہ تم نے اس کو پہچانا یہ کون تھا؟ بیوی نے کہا نہیں۔

باپ کے ادنیٰ اشارے پر بیوی کو چھوڑ دیا۔

اسماعیل علیہ السلام نے کہا کہ یہ میرے والد تھے اور انہوں نے جو یہ کہا ہے کہ دہلیز کو بدل دو اس کا مطلب جانتی ہو۔ بیوی نے کہا نہیں۔ اسماعیل علیہ السلام نے کہا کہ میرے والد کو تمہاری یہ ناشکری اور شکایت کی باتیں پسند نہیں آئیں۔ اس نے کہا ہے کہ اس بیوی کو چھوڑ دو۔ لہٰذا میں تمہیں اس وقت حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے چلی جاؤ۔ تمہارے اب اس گھر میں رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔"

(ماہنامہ صدائے اسلام پشاور بابت جولائی ۸۸ء صفحات ۱۰، ۱۱)

یہ روایت نہ صرف یہ کہ قرآن مجید کی واضح تعلیمات کے خلاف ہے۔ بلکہ سنت رسولؐ کے بھی خلاف ہے۔ آپؐ کے دور میں جب کسی نے ایک ہی مجلس میں تین طلاق اکٹھی دی تھیں تو آپ غصے میں کھڑے ہو گئے تھے اور فرمایا کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ (حقوق الزوجین از ابوالاعلیٰ مودودی صاحب صفحہ ۱۵۴ چھٹا ایڈیشن)

اس لئے اب ایسی طلاق، عائلی قوانین کے تحت جرم قرار دی جا چکی ہے۔ لیکن ہمارے علماء کو نہ تو قرآن و سنت کی پرواہ ہے اور نہ ہی ملکی قوانین کی۔ وہ مسلمانوں کے گھر برباد کرنے کے لئے معمولی معمولی باتوں پر عورتوں کو گھر سے دھکے دے کر نکالنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

۴۔ جرأت مندانہ فیصلہ

"ٹورنٹو (ریڈیو رپورٹ) کینیڈا کی ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ طلاق شدہ مسلمان عورت کو اپنے سابق شوہر سے مستقبل میں مناسب اور موزوں گزارہ الاؤنس لینے کا حق حاصل ہے عدالت نے کہا ہے کہ یہ گزارہ اس کے علاوہ ہوگا جو عدت کی مدت کے دوران لیا جائیگا۔ مسٹر جسٹس دھرم نے یہ فیصلہ نظر ثانی کے لئے آئی ہوئی چار درخواستوں پر مسلمان عورتوں کے حقوق اور طلاق کے متعلق قانون کے تحت نمٹاتے ہوئے سنایا ہے۔"

(روزنامہ جنگ مورخہ ۵ جولائی ۱۹۸۸ء)

تعزیت

نمائندہ بزم طلوع اسلام جہلم، محترم قمر پرویز صاحب نے اطلاع دی ہے کہ تحریک طلوع اسلام کے دیرینہ رفیق محترم بابو محمد افضل صاحب کے جواں سال صاحبزادہ اور بزم طلوع اسلام جہلم کے فعّال اور باہمت رفیق محترم محمد حفیظ افضل صاحب ۱۸، جولائی ۱۹۸۸ء کو انتقال کر گئے۔

ادارہ طلوع اسلام اور طلوع اسلام ٹرسٹ کے اراکین دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور ان کے والدِ محترم، اہلِ خانہ اور جملہ رفقاء کو صبرِ جمیل کی نعمت سے سرفراز فرمائیں۔

ادارہ

تعزیت

نمائندہ بزم طلوع اسلام کوئٹہ، محترم قدیر احمد خان نے اطلاع دی ہے کہ بزم کوئٹہ کے نہایت معزز اور جری کارکن محترم اختر عباس سعید صاحب (انسپکٹر آف سکولز ریٹائرڈ) ۱۸، جولائی ۱۹۸۸ء کی رات انتقال کر گئے۔ بزم کوئٹہ کے فروغ اور نمو اور قرآنی تعلیمات کی تبلیغ کے سلسلہ میں مرحوم نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔ اور ان کے پسماندگان اور رفقاء کو صبرِ جمیل کی نعمت سے نوازیں۔

ادارہ

قراردادِ تعزیت

جملہ اراکین بزم طلوع اسلام ملتان، محترم حسن عباس رضوی صاحب کی اچانک وفات پر گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ تحریک طلوع اسلام ایک فاضل اور سحر آفریں شخصیت کی رفاقت سے محروم ہو گئے ہیں اور ان کی وفات سے حلقۂ طلوع اسلام میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ مدتوں محسوس ہوتا رہے گا۔ اراکین دعاگو ہیں کہ اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور ان کے اہلِ خانہ و رفقاء کو اس جانکاہ صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

اختر علی
نمائندہ بزم طلوع اسلام ملتان

Quran whose punishments are also stated (namely against person, property and against the state) and it is interesting to note that after every offence comes the verse containing the concept or provision of **'Tauba'** and **'Islah'** followed by the steps of **'Ghafoor'** and **'Raheem'** to be taken by the State. If the entire system as envisaged by the Quran was promulgated, the whole world would have acclaimed it with three chains, terming it most modern, most humane, most just; but what pity that Allah who has proclaimed **Rahmat** (mercy) on His self, has to be dubbed as Allah who only gives whipping and there is no provision or scope of forgiveness or mercy in His Book - which thanks Allah, is not the case - (For detail see another article on "A commentry on Hudod Ordinance").

❀❀❀

احباب توجہ فرمائیں

ادارہ طلوعِ اسلام، مستقبل قریب میں انشاء اللہ، پرویز نمبر شائع کر رہا ہے۔ احباب سے التماس ہے کہ وہ محترم پرویز صاحب سے متعلق اپنی یادداشتیں، خواہ وہ ان کی نجی محفلوں سے تعلق رکھتی ہوں، تحریک پاکستان کے دوران ان کی خدمات پر روشنی ڈالتی ہوں یا ان کی قرآنی تعلیمات کے بارے میں ہوں، تحریراً ممکنہ سرعت کے ساتھ ادارہ میں روانہ فرمادیں۔ تاکہ انہیں منضبط شکل میں اس شمارہ کی زینت بنادیا جائے

ناظم ادارہ

in mind that it is normally applicable to those offenders, who are prepared to undo the wrong done by them (which in the Quranic terms is **Tauba**) and also promise to go straight and hebave (which Quran says **'Islah'**).

After these assurances, the state machinery comes into action:-

a. If the offender has committed crime, due to bad company, foul or unhealthy atmosphere or other psychological reasons, steps are taken to protect him from these factors - (this is the meaning of **Ghafoor** in Quranic terms, 'one who protects').

b. In case he is unemployed or underemployed or incapable of earning due to some handicap, old age etc., then the state provides him a job or provides him basic necessities of life free of cost, till he gets a job or becomes capable of earning - (this in Quranic term is the attribute of **'Raheem'** - that authority which provides source of nourishment free) - In a nut shell, the offender promises to:-

i. Undo the wrong done,

ii. Is prepared to reform himself and after these two conditions are fulfilled the state,

iii. Takes steps to protect him from all possible ill effects of the society, and

iv. Provides him all basic necessities of life, free of cost, till he is capable of earning and is well settled. This is called the most modern approach to the solution of crime and by adopting this, some countries have brought down the crime considerably. Now see the wisdom of the Holy Quran, where Allah Almighty says:-

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ۵/۳۹

Some points about the Hudood Ordinance:-

It is pity and unfortunate that while introducing the **Hudod** Ordinance in February, 1979, the Government, on the one hand retained dozens of clauses of the Criminal Procedure Code, without quoting any ahthority from the Quran and Sunnah, but while mentioning the punishment of theft by quoting verse 5/39, dropped the next verse 5/40, which in fact is part of the same order. The Government only introduced the penal system of Quran and not the other positive, reformatory system. In the Holy Quran this verse comes 129 times, but our scholars did not bother to include it even once. Four offences are mentioned in the

disgrace on his forehead being levelled as ex-convict or ex-prisoner and generally debarred from all employment.

v. He becomes more experienced and skilled in his job having learnt various tricks from co-prisoners.

So, how far, we are wise to spend millions of rupees on this class of criminals, particularly when the amount spent is counter productive, as the very system is contributory to crime escalation. There is lot of good in man and for a lapse, may be over which he had no control, he should not be condemned in total and that too for life time; all out efforts should be made to reclaim him as a healthy member of the society.

The new procedure adopted by the most advanced and modern countries have produced very positive results: the crime has come down by 30% alongwith the expenditure. Briefly the main features are:-

a. After the investigation of the offence, the case is examined by the prosecutor - then he sends for the complainant and the accused, they can also bring their attornies.

b. The prosecutor asks the parties, if they are willing that instead of sending the accused to the court, he could decide the case then and there.

c. If the parties agree (which normally they do), he would ask the accused to stand up and apologize from the complainant (so that hartred or ill will is negated).

d. Then he would ask the accused to pay some specific compensation to the complainant for the material loss, mental suffering etc. - which the accused pays or undertakes to pay (this is in reality the true justice when Quran says إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ ۝ ۱۶/۹۰ **Adl** is to give what is due and **Ihsan** is to give something more----. In our system, if a television is stolen and by chance, the thief is also apprehended, but the TV, or other stolen articles like ornaments etc. are not recovered, the thief is sent to jail: good enough: but what about the complainant's stolen property?

e. Then the prosecutor would tell the accused that he had wasted the time of the State and should pay a specific amount to the Government.

This in legal terms amounts to doing **Tauba'** - to undo, what wrong has been done by apologizing and paying the compensation. The second phase of this procedure is that the State functionaries try to find out as to why the offender has committed the crime? What is wrong with him? What treatment should be given to him to ensure that on the one hand he does not repeat his action and on the other the society remains safe and peace and order is not disturbed. So following steps are taken generally - This should however, be kept

THE REVOLUTIONARY CONCEPT OF TAUBA & ISLAH (5/39)

BY

HAJI HABIR-UR-REHMAN KHAN
INSPECTOR GENERAL OF POLICE (RETD)

The Phenomenon of crime is most complex, difficult and intricate. Man in the 20th century is feeling proud to have landed on the moon, but his helplessness to understand and then meet the challenge of crime is most distressing. Every day we hear cries from all over the world for coutrageous violation of law. The more affluent, more educated and more civilized we become, the index of crime also keeps pace. It goes on spreading like a virus all over the world, but in western countries and America it is touching alarming peaks.

There are, however some countries in the world, Japan being the pioneer, who have controlled it, by discarding the stereotyped, orthodox approach and adopting the 'Non-Institutional' procedure. The traditional approach is that after the commission of an offence, it is investigated by the Police and then sent to the court for trial where either the accused is acquitted or punished by imposition of fine, whipping or imprisonment, even for life time, depending on the nature of the case.

The criminologists thought over it and after extensive study came to the conclusion that:-

a. The punishment of imprisonment was extremely injurious to the accused and to the society. A person who has committed crime has injured the society and by sending him to jail, we multiply that injury many fold:-

   i. While he was outside, he was earning and paying taxes to the state, which henceforth he would not.

   ii. In jail, he is getting everything free, and the real sufferers are his family members for whom no one is responsible.

   iii. In jail, all his expenses are being paid by the state: an unnecessary expenditure which should be spent on development work or else where.

   iv. When he comes out of jail, he carries a permanent stigma of

In the meantime, Syed Ahmed inauguarated in 1886 at Aligarh the "Muhammaden Educational Congress" renamed "Conference" in 1890 because the word "Congress "became associated with the agitational politics of the Indian National Congress, with which he did not wish to be confused) to spread the ideals on which M.A.O. College was based. While the College educated a small group of students, the Conference was to educate the people far and wide. Its meetings were held in different towns each time so that more and more people could be reached. Under its auspices books of value were also written and published for wider circulation.

Ultimately it was hoped that the Muslim nation would awaken and appreciate his efforts in moving towards excellence.

❀❀❀

نئی کتاب "قبلۂ اوّل"

محترم حسن عباس رضوی مرحوم کی علمی تحقیقی کاوش "قبلۂ اوّل" شائع ہوگئی ہے۔ اس پر تبصرہ ماہِ اکتوبر ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں کیا جائیگا۔
کتاب کی قیمت -/۳۵ روپے ہے اور یہ النّور پرنٹرز و پبلشرز اور طلوعِ اسلام ٹرسٹ سے دستیاب ہے۔

policy to follow.[38]

However, Syed Ahmed's religion was not the traditional Islam of the Ulema and the masses controlled by the Ulema. He wrote copiously on the subject, charging the Ulema for presenting Islam in such an ugly form. He was convinced himself that Islam could not be falsified by the light of any knowledge.[39] and that in essence while Nature is the work of God, religion is the word of God and hence the two can never contradict each other. Now, Syed Ahmed's religious concepts are not the field of study in this paper. What needs to be emphasised is that to him man would be incomplete without religious instruction. But what has confused and disappointed some commentators is that in M.A.O. college, the concrete focus of his life-long mission, religious syllabus and instruction was left in the hands of a committee of Ulema, who were his bitter opponents. Abdul Hamid wonders that one who was so despotic in getting things done his own way on many issues, was no longer despotic in this case.[40] In a footnote J.M.S. Baljon says, "Curiously enough all modern views were scrupulously avoided in the religious instruction of the college. "[41] There were also two mosques, one for Shias and one for Sunnis, and prayers were compulsory, all in the traditional style. This "surrender" to his opponents the Ulema whom he never hesitated to describe as the cause of all Muslim suffering and his own strict aloofness from religious instruction does seem strange and unfortunate. But Syed Ahmed had guaged the situation and come to the conclusion that in the face of Ulema opposition,[42] and their hold over the thoughts of the people, his educational policy may never be launched. He had full confidence in that once the students imbibe modern western knowledge they would on their own accord reject the traditional religious ideas and look for something more convincing. For such a possibility he had written much for them to read. In the later years, in spite of his hectic life and ill health he got busy writing his "Commentary on the Qoran" with this very objective in view. What was important was to inclucate the western spirit, the essence of the Renaissance amongst his people. Once this spirit was thoroughly internalised, the rest would follow and the students would seek his works and avidly read them. Thus while he, for the time being, gave in on this front, he absolutely refused to compromise on the Trustee Bill which guaranteed the appointment of European professors and the western spirit.

38 Muqalate - Sir Syed - Volume XII page 168-169.
39 Khutbat-e-Sir Syed - Volume II page 482.
40 Abdul Hamid - "Muslim Separateness in India" page 41.
41 J.M.S. Baljon - Sir Sayyid Ahmed Khan page 54.
42 See Chapter IX.

beings. After all it was not the external behaviour, the monkey-like performance of a few social mannerisms that cultivate a man. "Refinement is not this, but that thought and action which is in harmony with nature. "[35] It was this kind of cultivation and collective living that builds a nation.

Of course his people did not understand what he was aiming at. They were not willing to send their children. He therefore invited them to come and see the boarding house of M.A.O. College in Aligarh where he was attempting all this. The children were protected and well taken care of, and did not waste their time playing with the children of the cook, the "Syce" or the "aya", and getting mixed up with the 'bazari' rowdies. In Aligarh the parents could see how Samiullah Khan, Mushtaq Hussain, Khawaja Muhammad Yousuf and Muhammad Akbar and others took loving care of the children and nursed them when they were ill.

Syed Ahmed challenged that even in England, a society so cultured, the need for boarding houses was felt. Both Oxford and Cambridge were residential universities. It was from here once again that he sought inspiration. Comparing it with the London University, which was not residential, he said the students of this university do not feel that sense of pride as those of Cambridge and Oxford.

Just as he was keen to associate European professors in the teaching section of his college, he was keen also to have a European warden for the boarding house. The essence of its raison d'etre has been discussed in Chapter VI. Thus the European Principal and other professors maintained a close laison with the boarding house in the activities of their Students' Union, Debating Society and other social activities. They occasionally dined with them too.

In his concept of a cultured man religion played an integral part. He believed that "religion has to be the basis of education. No man and woman has received education without it."[36] This view was expressed many a time in his prolific writings. Accordingly, religious instruction was made compulsory in M.A.O.College. In 1891 he even got a resolution passed in the meeting of the Muhammadan Educational conference held at Aligarh to the effect that "Government College in any area should make proper provision for religious education for Muslims. "[37] This shows his keen anxiety on the subject although all along he had felt that it was wise on the part of the English and Christian Government to have decided not to intervene in religious instruction of the people. In a varied population with its varied religious interests this was the best

35 Khutbat-e-Sir Syed - Volume I page 138..
36 Muqalate - Sir Syed - Volume VIII page 102.
37 Khutbat-e-Sir Syed - Volume II page 232.

the servants' children, and in the corrupt "bazari"[30] atmosphere, rubbing shoulders with uncouth, vulgar rowdies of the town.[31] This kind of association plays havoc with the impressionable minds of the children. Their ethics, their behaviour, their habits were deteriorating, and yet they were the ones on whom depended the future. Many 'Rais' (rich and wealthy families) think that they can properly educate their own children. Here they were mistaken. One cannot live in isolation. Ignorance and corruption spreads like an epidemic. Unless the whole society was cleansed, no one could be immune from its dangerous impact. Unless the whole society was cultured, a few individuals could not claim to be so. Culture demands constant communication on a certain level. An individual could not develop his inner potentials, thoughts, goodness, strength, unless he could talk to others. Thus "a nationwide group that is cultured can do a lot even with a little education. But a scholar in an uncultured group does not gain much. "[32] Cuture was thus the result of collective effort. But the case of the Indian Muslims was like "each taking his own can of water and individually trying to irrigate the desert, hoping it would become a lush green graden. It could not, it did not, and it will not."[33]

What was the solution to this problem? Syed Ahmed found it in the residential college, that is, in the boarding house system. One of the most important features of the M.A.O. College of Aligarh was that each student admitted had to be a boarder. The idea was to separate the children from their homes and from their environment for the simple reason that there did not exist a cultured society in Muslim India as in England. It was almost like enclosing them in a house where no external influences could penetrate. Here they would be totally absorbed in the college life with no other thought and activity but education and culture. Here they would have the company of excellent professors, have walks with them in the garden, be happy and adopt excellent habits, play games and improve their health in the open, airy, sunny and spacious surroundings. "The idea of the residential system is that the children should assemble together in one place, live in one place, study in one place, eat in one place, sleep and wake up in one place, play in one place and live and die in one place."[34] The atmosphere would be that of mutual love and affection, feeling of brotherhood, and mutual sharing of everything. It was here that they would learn the qualities of manliness, truthfulness and goodness, and become better human

30 In those days and until recently the "bazars" were generally frequented by undesirable elements. Hence the word "bazari" came to mean "uncultured".
31 Muqalate - Sir Syed - Volume XII pages 158-160 and 177-180.
32 Khutbat-e-Sir Syed - Volume I page 138.
33 Khutbat-e-Sir Syed - Volume II page 245.
34 Khutbat-e-Sir Syed - Volume II page 250.

a Plato. It means that even an uneducated person in the nation develops an intellectual attitude and curiosity. "[26] As a "human being", different from other animals, a man has immense posibilities and can keep on progressing.[27]

Above all he emphasised that education is no educatin unless it makes man a "human being". Education should instil in him humanity, manliness, goodness, truthfulness, daring of a soldier, courage and hard work.[28] Quoting Morrison, a lecturer of M.A.O. College he said the purpose is not to impose regementation upon the students, but to provide such opportunities that the students become inclined towards good and abstained from bad.[29]*

This brings us to a factor in Muslim Indian Social Life which punctuated most of Syed Ahmed's articles and speeches. This was the distinction that he made between "Taleem and Tarbeeat". These two Urdu words must be defined to derive their true import. "Taleem is used for pure information and knowledge that is poured into the mind from outside. "Tarbeeat" is basic humanity, refinement, culture that manifests itself by developing the innate potentials of a human being. Thus for the sake of our own understanding the words "education" and "culture" will be used as their equivalents. Syed Ahmed believed that two were separate disciplines. Education could give B.A. and M.A. degrees but it could not clean the corruption of the innerself. Books alone do not help.

When comparing the two, culture was supreme over education from Syed Ahmed's point of view. He lamented the fact that while education was being provided, however limited and defective it may be, no attention had been given by the Muslims to culture. Many highly educated people he knew sadly lacked culture. It was of a very low order. Obviously mere degree holders were not necessarily cultured people. Education and culture are, therefore, inseparable, they are complementary to each other.

Syed Ahmed regretted that parents were not bothered about the cultured upbringing of their children. He had personally observed in many big cities he had lived in and known well, that the environment was least conducive to culture. Even if the children went to school, they spent barely five hours with the teachers. Rest of the time they were in the undesirable company of servants or

26 Muqalate - Sir Syed - Volume XII page 270.
27 Ibid page 170-172.
28 Ibid pages 247-248 and 252-253.
29 Khutbat-e-Sir Syed - Volume II pages 365-368.

Before the Education Commission again Syed Ahmed had spelled out the idea that "the public cannot obtain suitable education unless the people take the entire management of education into their own hands....it would therefore be more beneficial to the country if Government should leave the entire management of their education to the people, and withdraw its own interference. "[22] This was in 1882. In 1894, in his address at Jullundur he spoke about it in a more revolutionary manner. He said: "The Universities and our College boys could be compared to masters and slaves. They eat whatever crumbs of bread the University throws before them and are content. O Friends! Our real education would be possible only when it is in our own hands and is free from the control of universities. "[23] This is what Syed Ahmed clamoured for ever since he launched his educational programme but it was never granted. He died a sad man four years after he made the speech at Jullundur, his this particular vision towards excellence unfulfilled.

Another programme that he had in mind in his pursuit of excellence was once again an inspiration from Oxford and Cambridge. This was the system of "fellowships", which enables the students, after completing his basic education, to get absorbed in research and achieve a high standard by discoveries and by writing excellent papers and books, thereby benefitting the country and adding to the knowledge of the people by publishing their works.

In India whatever half-baked knowledge the students acquire, is never pursued further for lack of such facilities. An effort was made in M.A.O.College Aligarh but because of the paucity of financial resources the plan of "fellowships" perforce had to be abandoned. [24]

Irrespective of all these limitations Syed Ahmed continued to inculcate among his people the love of knowledge. While he pressed upon them that education was essential for jobs, for government services and also for the understanding of the intricacies of modern trade and import and export, still knowledge for knowledge sake was perhaps the greatest of joys. Once this is realised the "worshippers of the stomach" will start enjoying knowledge a lot more. There will be a better understanding of God's creation. To know someting about the bees and the ants increases ones wonder at the marvels of this creation.[25] Aiming at the education of the whole nation he explained that "universal education does not mean that each individual becomes a Socretes and

22 Altaf Hussain Hali - "Hayate-Javaid" page 293.
23 Khutbat-e-Sir Syed - Volume II page 276.
24 Muqalate - Sir Syed - Volume VIII pages 30-31.
25 Khutbat-e-Sir Syed - Volume II page 275.

higher education, but there was no entry into them.[17] The students may know a little about all subjects but they do not specialise in anything. He protested against this before the Hunter Education Commission in 1882. Referring to the Calcutta University as an example he said that "it is an incomplete imitation of the London University, with the result that the graduates do not acquire specialised knowledge in any subject. "[18] This kind of shallow knowledge is destructive because it makes the student self-conceited. "The moment he receives a degree he thinks he has become a scholar. Actually it is all hollow inside. He does not even know the meaning of freedom, patriotism, and politics. "[19] The hollowness becomes a painful reality when students go to London to take the competitive examination for the Indian Civil Service. The Report of the Director of Public Instruction held the prevailing educational system responsible for this. Indian boys were not inherently lazy or mentally incapacitated. They were victims of a very defective system that does not make them what they aught to be at the age of twenty, so that they could successfully compete in the I.C.S. examination.[20] This system does not even give them command over the English language. Their acquaintance with it as a mere gibberish is pathetic. Thus the whole thing was an exercise in futility. Those who really wish to achieve some excellence must eventually go to Cambridge and Oxford. There they would have the added advantage of observing and experiencing what in India is mere theory in the class rooms.

He aserted therefore that by giving statistics of the number of students who passed in the year was no basis of judging educational standards. He advised the Education Commission to give grants-in-aid to those institutions that showed quality and not base it on the number of students enrolled.

What was the solution to this very unsatisfactory system of education? He frankly came to the conclusion that Government controlled Universities could not give national education. In fact Syed Ahmed wanted Aligarh M.A.O. College to be a University. Permission, however, had not been given. Then Syed Mahmud in his address at the time of the foundation laying ceremony had expressed the hope that "this college may expand into a university whose sons shall go forth throughout the length and breadth of the land to preach the gospel of free inquiry of large-hearted toleration and of pure morality."[21]

17 Khutbat-e-Sir Syed - Volume I page 581.
18 Altaf Hussain Hali - "Hayate-Javaid" page 292-293.
19 Muqalate - Sir Syed - Volume VIII page 32.
20 Khutbat-e-Sir Syed - Volume I page 583.
21 Graham - "Syed Ahmed Khan" pages 173-80.

country by way of good education in government and missionary schools. This was positively ill-treating the children.

Syed Ahmed was not against mass education. He merely suggested that his people "should not think of establishing a school unless it can be an entrance school, and unless a really learned European headmaster can be employed. For this at least twelve hundred rupees a month would be needed. Anything below this would be a disservice to the children and we would rather do without it, for it would be destructive."[12] He warned that "Education is a very delicate matter. Its results, good or bad, may not be visible at once, but they are subtle and far-reaching. "[13]

Syed Ahmed thus consistently defended the cause of higher education. There was a time when it was feared that the Government intended doing away with higher education. But , he with his characteristic courage and boldness criticised the Government's intentions, and wrote in defence of maintaining and further developing higher education.[14] (This factor in itself vindicates Syed Ahmed's stand, because it is higher education based on western learning that could guarantee an independent and a respected place in the world for India of the future. The foreign ruler was afraid of both. This has been partially refered to in Chapter VI as well.)

Because higher education was so important, Syed Ahmed was very much concerned about its quality. He was never satisfied with it. Vincent Smith says that in the interest of popularising western education standards had been relaxed, because experience had shown that very few passed their graduation and very few qualified for admission in colleges and universities. "The result was a lowering of standards, which once started, was difficult to stop because there existed no easily available yardstick against which to measure Indian standards. The obvious one was that of London University, and once this was abandoned there was no other."[15] According to Syed Ahmed this was very unfortunate state of affairs. He protested against this policy whenever he spoke on the subject. His complaint was that the universities hardly imparted higher education. The word was a misnomer. The educatoin was not high; it was very low indeed.[16] Good education cannot be acquired by reading a few books and cramming them for the examination. The universities have only taken the students upto the portals of

12 Khutbat-e-Sir Syed - Volume I page 598-599.
13 Ibid page 595.
14 Altaf Hussain Hali - "Hayate-Javaid" page 461.
15 V. Smith "The Oxford History of India" page 719.
16 Muqalate - Sir Syed - Volume VIII page 31.

among the masses. He said history of any nation in the world proved it. It is Nature's Law that the lower imitates the higher, the higher never imitates the lower. Those who were keen that primary education should be widespread, should actually work for higher education, for higher education would seep down to the lower level. Thus the few highly educated "were to act as a leaven for the rest of the nation."[9] Seeing it from this angle he challenged those who were thinking of establishing many more primary schools as to whether the higher education in the country had already reached its pinnacle![10]

What the country needed was an excellent college and excellent teachers. The Muhammadan Anglo-Oriental College was trying to become 'excellent', but it still fell short of its determined goal. It was still incomplete and deficient of many things. Would it not be better that all national resources and time and energies were concentrated on one solid institution such as this? By establishing primary schools all this was being frittered away, for whatever money was being dissipated in establishing small useless schools should have been spent on one good college. It is true that all Indian Muslims cannot be assembled in one college and in one place. Neither are these resources enough to establish a good college for higher learning in every province. But eventually it was just one excellent college that would make all this possible.

Apparently, it seemed pleasant that by establishing numerous primary schools a vast majority of poor people would become literate. Syed Ahmed never doubted the good intentions of the founders of these schools. In fact he appreciated that people had at last been thus motivated. What made him apprehensive was the low standard of these schools; he rejected them because quality was being sacrificed for quantity. He pointed out that "To open a small school, and employ an Indian headmaster with a salary of a hundred or a hundred and fifty rupees a month is not the way to lay the foundation of national education. This cannot be accomplished unless excellent schools with excellent provision for education is not guaranteed."[11] He therefor advised them that if they can establish really good schools, they may go ahead. But if they cannot, they must not. Their usefulness can only be accepted if they can provide the best. It was no secret that there was lack of funds and there was paucity of good teachers and headmasters. He asked as to whether any school established by the Muslim Community was better or was as good as the government or missionary schools? Do they have equally qualified teachers? Thus by opening these schools they were only depriving the Muslim Children of whatever good there was in the

9 Muqalate - Sir Syed - Volume XII page 254.
10 Khutbat-e-Sir Syed - Volume I page 598
11 M...

ultimate objectives. We have to see how and what kind of stars were to twinkle in the black firmament of Muslim India.

As the political hegemony of the East India Company expanded, the governments of the various provinces, Bengal, Bombay, Madras and the North-Western Province established schools and colleges in their respective areas. The issue that often came up was as to what educational.policy should predominate: Should the revenues be spent more and more on mass education or higher education. Should there be an elementary school in every village and tahsil?[4] Since the emergence of Syed Ahmed as the leading educationist in Muslim India, the Muslim community had been inspired to establish schools in various towns and villages. Syed Ahmed took a strong exception to this and threw his full weight in favour of higher education. He urged his people to weigh the pros and cons carefully and then decide what is beneficial for them. According to him "This nation needs a group of highly educated people, highly proficient in varied subjects. We need a group of people who with their wisdom and understanding, effort and struggle, advance their knowledge day by day and raise the prestige and pride of the nation by their fame and achievements. "[5] During its decline and fall, the nation had lost any scholarship that existed in traditional oriental learning, and now that the nation was moving towards the "New Light " there was terrible paucity of scholarship and research, in fact it was almost non-existent. A nucleus of highly qualified experts must be present if the nation was to take off in the field of mass education. He tried to explain this by comparing them with a dam full of water which can be canalised into many branches. But canals cannot be dug from a dry water-less tract.[6] He warned his people again and again that "little knowledge is a dangerous thing" and primary education in any case is incomplete.[7] In an important and long speech at Lucknow in 1887[8] he vehemently criticised the innumerable primary schools that had sprung up with hordes of children in them. He said he was not being contemptuous or considered them unnecessary. But by opening primary schools is like giving only food to the man who is both hungry and thirsty. By ignoring higher education, the nation is being denied water. The nation's thirst must be quenched.

His theory was that unless higher education is not spread in the greater nations, the smaller nations cannot acquire it. Similarly unless higher education does not exist in the country, it is impossible to spread elementary education

4 W.Meston - "Indian Educational Policy pages 5-49.
5 Khutbat-e-Sir Syed - Volume I page 267-263.
6 Khutbat-e-Sir Syed - Volume I page 324.
7 Muqalate - Sir Syed - Volume XII pages 168-169.
8 Khutbat-e-Sir Syed - Volume I pages 591-603.

— Contined from August 1988 —

CHAPTER VII

PURSUIT OF EXCELLENCE

"I wish to liken my nation unto the sky that we perceive at night. When I look at it at night I do not notice that part of it that is dark blue and black, almost frightful. But I fix my gaze on the stars that shine and winsomely atract us by their twinkle, and because of whom the sky acquires a wonderful beauty of its own. "With these words Syed Ahmed addressed his nation at Lucknow in 1887[1] and then again in 1894 while speaking to the Educational Conference at Aligarh.[2] These words describe his objectives and standards so well that Hali, his friend and biographer, has quoted them in the front page of his book. In the darkness of ignorance all around him, he was forcefully defending higher education that would produce "excellent " students. In the vision of his Muhammadan Anglo-Oriental College that he wrote about in "Tahzibul Akhlaq" (1872), in response to the clamouring demands from many people, who wanted to know what it would be like,[3] Syed Ahmed uses the word "excellent" or its equivalent on many occasions. Describing the three sections that he proposed for the college he wrote that "Each Section of the College would impart excellent standard of education and each would have extremely learned and able professors. The Principal of the college would be extremely good and learned and a well-known personality." After making this general remark, he specifically states that "the professor for the English section would be a learned and good person.... the professors for natural sciences and mathematics would be extremely learned and good Englishmen..... Indian professors would be products of English colleges and medal holders in highter education ...The Arabic and Persian Section would have very great Maulvi-scholars "So much for teachers. Talking about buildings of the college he said they would be spacious and grand, standing in the midst of parks and gardens. There would be, to begin with, a hundred independent houses with a bathroom, a bedroom and a sitting-cum-reading room each for the richer students. There would be a play-ground, a sports pavillion, a swimming pool and a riding track. And everything would be the best. It is to the credit of Syed Ahmed that with his boundless energy, enthusiasm and determination, this daydream of his became very nearly true. Visitors, both Indian and Englishmen, admitted that its buildings were perhaps the grandest in India. He was also able to attract good and scholarly teachers from England as well as India. However, buildings and teachers were only the prerequisite of his

1 Khutbat-e-Sir Syed - Volume I page 597.
2 Khutbat-e-Sir Syed - Volume II page 316.
3 Muqalate - Sir Syed - Volume X pages 153-170.